Regd. L. No. 7243

Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1984

اس پرچہ میں

(مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم)
اور پاکستان

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ 4 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ـــــ لاہور

بدل اشتراک	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان /۴۸ روپے غیر ممالک /۹۸ روپے	خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	۴ چار روپے
جلد ۳۷	ستمبر ۱۹۸۴ء	شمارہ ۹

فہرست

۱۔ یوم آزادی کی تقریب پر خطاب (محترم پرویز صاحب) ۲

۲۔ (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) ـــــ ۱۷

۳۔ حقائق و عبر : ـــــ ۳۳

(۱) تیری بربادیوں کے تذکرے ہیں آسمانوں میں
(۲) فقہ حنفی کتاب و سنت نہیں (۳) بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ؟
(۴) علامہ اقبال اور دو قومی نظریہ (۵) بھانت بھانت کی بولیاں
(۶) ایک جہادِ عظیم (۷) اجتماعی توبہ

۴۔ حج کا مقصد (محترم پرویز صاحب) ـــــ ۴۳

۵۔ مفسدین کا انجام (محترم پرویز صاحب) ـــــ ۵۴

طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک ـــــ ۶۴

یومِ آزادی کی تقریب پر درسِ قرآن

عزیزانِ گرامی قدر! السلامُ علیکم

آج کا درس اس انقلابِ عظیم کی یاد میں دیا جا رہا ہے جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ظہور پذیر ہوا اور جسے یومِ آزادی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ آزادی کا لفظ تو مختلف اقوام میں مشترک ہوتا ہے لیکن معانی کے اعتبار سے اس میں اس قدر فرق ہوتا ہے جس قدر آزادی اور غلامی میں۔ یعنی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک قوم، عام تصور کے مطابق آزاد ہونے کے باوجود غلام کی غلام رہے۔ ہندوستان میں تحریکِ آزادی بڑے زوروں پر تھی۔ مقصد اس سے انگریز کی حکومت سے نجات حاصل کرنا تھا۔ علامہ اقبالؒ جس قدر انگریز اور انگریزیت کے دشمن تھے اس پر ان کا سارا کلام شاہد ہے۔ فریادِ ز افرنگ و دلآویزیٔ افرنگ۔ عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ۔ ان کی عمر بھر کی پکار تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی سے کنارہ کش تھے۔ ان کے نظریہ اور مسلک کے اس (بظاہر) تضاد کے پیشِ نظر، مولانا حسین احمد مدنیؒ نے ان سے کہا کہ جب آپ بھی انگریز کی غلامی کی زنجیروں سے آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو آپ کانگریس کا ساتھ کیوں نہیں دیتے۔ تاکہ دونوں کی مشترکہ جدوجہد سے یہ مقصد بآسانی حاصل ہو جائے۔ اس کے جواب میں حضرت علامہؒ نے جو کچھ فرمایا، وہ نہ صرف مسلمانوں اور غیر مسلموں کے نقطۂ نگاہ سے آزادی اور آزادی کے مفہوم کے اختلاف کو واضح کر دیتا ہے بلکہ نیشنلسٹ علماء کے تصورِ اسلام اور اقبالؒ اور جناحؒ کے تصورِ اسلام میں حدِ امتیاز کو بھی واضح اور روشن کر دیتا ہے۔ آپ نے فرمایا

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں بلکہ ہمارا اوّل مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریز کی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام

بن جائے۔ لیکن اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دار الکفر ہے ایسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادی وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا بولنا روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا۔ گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے۔ (معرکہ دین وطن)

اس کے جواب میں مولانا مدنی (مرحوم) نے فرمایا کہ جس آزادی کے لئے ہندو کوشاں ہے اس میں اسلام محفوظ رہے گا۔ کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی رہتی ہیں۔ اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ لگے
(متحدہ قومیت اور اسلام ص ۶۱)

اس پر علامہ اقبال نے تبسم زیر لبی کے ساتھ فرمایا کہ مولانا صاحب! یہی تو آپ حضرات کی بھول ہے جس اسلام کو آپ اسلام سمجھ رہے ہیں وہ اسلام ہے ہی نہیں۔ اسلام کی ضد اور نقیض ہے۔ وہ مسلمانوں کے دورِ ملوکیت کا تراشیدہ مذہب ہے۔ دین خدا مذہب نہیں ہے۔ اور ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے — شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ ملا و جمادات و نباتات

ہم جس آزادی کے لئے مصروف جدوجہد ہیں اس سے مقصد اس اسلام سے نجات حاصل کرنا ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت کی ایجاد ہے اور جس کے اجارہ دار آپ حضرات ہیں۔ ہم جو مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی صحیح معنوں میں تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔
(خطبہ الہ آباد سن ۱۹۳۰ء)

اس عمیق نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے سید حلیم پاشا (مرحوم) کی ہم نوائی میں فرمایا۔

اندریں حالات ہمارے لئے کشت و کار کی ایک ہی راہ ہے۔ اور وہ یہ کہ آئینہ اسلام پر غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں۔ اور جس

کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظر بہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے۔ انہیں کھرچ کھرچ کر الگ کیا جائے، اور حریت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سر نو زندہ کرکے، ان کی بنیادوں پہ اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیل جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو

(خطبات تشکیل جدید۔ چھٹا خطبہ)

انہوں نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

تمہارے دین کی عظیم الشان بلند نظری ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ ادہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات وجذبات کے ایک قید خانے میں مقید ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے۔ اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضرہ میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں۔ نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔

(خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس مارچ ۱۹۳۲ء)

یہی کچھ قائد اعظمؒ کہتے رہے۔ انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی یونین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

مسلم لیگ نے کم از کم ایک کام تو کر دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں مسلمانوں کے رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ خود غرضی کا مفاد پہ سنسنانہ کھیل کھیل رہے ہیں وہ قوم کے غدار ہیں۔ اس نے بلا شک وشبہ تمہیں اس ناخوش آئند عنصر کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔

(تقاریر۔ حصہ اوّل صفحہ ۲۸۹)

انہوں نے ۱۰ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیجسلیٹرز کنونشن کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے اور پھر بحیثیت گورنر جنرل فرمایا:

اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک اسٹیٹ نہیں بنانا چاہتے جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔ (تقاریر جلد دوم صفحہ ۳۸۶) (بحیثیت گورنر جنرل صفحہ ۱۵)

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ حصولِ پاکستان سے مقصد، اس اسلام کو ختم کرکے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا، اور جس کی اجارہ دار ہماری مذہبی پیشوائیت ہے۔ اس کی جگہ صدرِ اوّل کے اسلام کو نافذ کرنا تھا۔ وہ اسلام جس میں حق حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں ہوتا۔ حکمرانی صرف کتاب اللہ کی ہوتی ہے حضرت علامہ کے الفاظ میں۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بےہمتا کو ہے ... حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

قائداعظمؒ نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی کہ:

اسلامی مملکت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست اور معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کیلئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

(حیدرآباد دکن میں انٹرویو)

یہ تھا وہ بنیادی مقصد جس کے لئے ہم نے پاکستان مانگا تھا۔ اس کا دوسرا مقصد نظامِ سرمایہ داری کو ختم کرکے اس کی جگہ قرآن کا معاشی نظام قائم کرنا تھا جس میں کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ غریب اور امیر کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ قائداعظمؒ نے واضح طور پر اعلان کر دیا تھا کہ:

میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز، ابلیسی نظام کی رو سے جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے۔ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے۔ اگر پاکستان سے یہی مقصود رہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی رمق بھی باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ۔

ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔
(آل انڈیا مسلم لیگ کا سیشن ۱۹۴۳ء)

اسلام کا بنیادی نظریہ، عزیزان من! کلمہ توحید لاالہ الا اللہ ہے۔ اس میں حصہ اوّل لا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے حلقۂ آغوش میں آنے کے لئے، ان ان چیزوں کو چھوڑنا ہوگا۔ تحریک پاکستان کے دوران یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ اسلامی مملکت کے قیام کے لئے کون کون سی چیزوں کو چھوڑنا ہوگا۔ بنیادی طور پر یہ تھیں انسانوں کی ہر طرح کی حکومت، یعنی اسلام جو ہمارے عہد ملوکیت میں وضع ہوا تھا اور جس کا مدار وضعی روایات اور انکی روسے مرتب کردہ فقہی قوانین پر تھا۔ مذہبی پیشوائیت کا اقتدار اور نظام سرمایہ داری۔ اور اس کے بعد حصہ الّا۔ یعنی یہ کہ پاکستان میں اس اسلامی نظام کا قیام عمل میں آسکے گا جو عہد محمد رسول اللہ والذینؓ معہ کے زمانے میں وجہ تابانی عالم ہوا تھا۔ یہ امر میرے لئے باعث ہزار سعادت ہے کہ میں تحریک پاکستان کے دوران بھی اس اسلام کے درخشندہ گوشے، قوم کے سامنے پیش کرتا رہا اور گذشتہ سینتیس (۳۷) سال سے پاکستان میں مسلسل یہ فریضہ ادا کئے چلا آرہا ہوں اس لئے کہ جب تک صدر اوّل کے اسلام کے نمایاں گوشے سامنے نہ آئیں یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ ہم نے پاکستان کس مقصد کے لئے حاصل کیا تھا۔

صدر اوّل کے اسلامی نظام کی بنیاد نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں سے رکھی گئی عہد حضرت صدیق اکبرؓ میں اس پر اور ردّے رکھے گئے۔ لیکن وہ اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ عہد حضرت فاروق اعظمؓ میں جلوہ بار ہوا۔ آج کی نشست میں بھی میں اسی عہد کے چند نمایاں کوائف پیش کرنے کی مسرت حاصل کرتا ہوں۔ آپ انہیں غور سے سنیے اور پھر سوچئے کہ اگر مملکت پاکستان میں اس انداز کا نظام قائم ہو جاتا تو آج ہمارا ہی نہیں عالمگیر انسانیت کا مقام کس قدر بلند ہوتا۔

قرآن کریم کی رُو سے مملکت کی ذمہ داریاں وہی شخص سنبھال سکتا ہے جسے قوم باہمی مشاورت سے اس منصب کے لئے منتخب کرے۔ اصطلاح میں اسے خلیفہ اور اس کے عہد حکومت کو خلافت کہا جاتا ہے۔ جو شخص قوت کے بل بوتے پر اقتدار حاصل کرے اسے بادشاہ یا شہنشاہ (دور حاضر کی اصطلاح میں آمر یا ڈکٹیٹر) کہا جاتا ہے اور اس کے انداز حکومت کو ملوکیت جو قرآن کے یکسر خلاف ہے۔ خلافت اور ملوکیت میں یہ امتیاز ازلیوں سمجھئے کہ آئینی یا دستوری ہے۔ یعنی

حصولِ اقتدار کی جہت سے امتیاز۔ اس کے بعد دونوں میں فرق یہ ہے کہ خلافت میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہوتی ہے اور ملوکیت میں انسانوں کی حکومت۔ جہاں تک اس کا اثر عوام پر پڑتا ہے اس کے متعلق ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے حضرت سلمان فارسیؓ سے پوچھا کہ میں خلیفہ ہوں یا بادشاہ؟ انہوں نے کہا کہ

> اگر آپ نے مسلمانوں سے ایک درہم (یا اس سے بھی کم) وصول کیا اور اسے صحیح مقام پر صرف نہ کیا تو آپ بادشاہ ہیں۔ خلیفہ نہیں۔

ایک اور صحابی نے اسی قسم کے سوال کے جواب میں کہا۔

> خلافت اور ملوکیت میں فرق ہے۔ خلیفہ عوام کے جملہ حقوق کا محافظ ہوتا ہے۔ وہ ہر انسان کا حق حفاظت کو رکھتا ہے۔ وہ نہ ناجائز طور پر کسی سے کچھ لیتا ہے، نہ ناجائز خرچ کرتا ہے۔ بادشاہ زبردستی کرتا ہے۔ ایک سے چھین کر دوسرے کو دیتا ہے۔ الحمد للہ کہ آپ خلیفہ ہیں۔ بادشاہ نہیں۔

یہاں کہا گیا ہے کہ خلیفہ ناجائز طور پر کسی سے کچھ نہیں لیتا۔ اصولی طور پر جائز اور ناجائز کی حدبندی قرآن کرتا ہے لیکن عملی طور پر حضرت عمرؓ نے اس کی ایسی وضاحت کی جس سے انسان کی نگۂ بصیرت میں چمک پیدا ہو جاتی ہے

> ایک نو آزاد شدہ غلام (سعید) کا بیان ہے کہ میں مملکت کے واجبات ادا کرنے کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس آیا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے مملکت کے بیت المال سے کچھ فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ ابھی تک تو نہیں اٹھایا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ پھر اپنی رقم واپس لے جا۔ جب ہماری طرف سے تمہیں کچھ مل جائے تو پھر آنا۔ اس چھوٹے سے واقعہ سے جائز اور ناجائز میں جو خطِ امتیاز کھینچا گیا ہے اس کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے!

ایک دفعہ آپ سے کسی نے پوچھا کہ آپ اپنے تجربہ کی بناء پر بتایئے کہ خلافت کسے کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ:۔

> خدا کے سامنے حساب دیتے وقت بتایا جاسکے کہ کہاں سے لیا تھا اور کیسے دیا تھا۔ اگر اس کا جواب اطمینان بخش ہوا تو یہ خلافت ہے۔ ورنہ ملوکیت۔

ایک درہم

اس باب میں احتیاط کا عالم یہ تھا کہ (حضرت) معیقیبؓ بیت المال کے خزانچی تھے۔ ایک دن بیت المال میں جھاڑو دینے لگے تو کوڑے میں سے ایک درہم (اس وقت کا کم از کم سکہ) ہاتھ لگا۔ اتفاق سے حضرت عمرؓ

کے گھر کا ایک بچہ پاس کھڑا تھا۔ خزانچی نے وہ درہم اس بچے کو دے دیا، اور گھر چلا گیا۔ ابھی گھر پہ پہنچا ہی تھا کہ امیرالمؤمنین کا بلاوا آ گیا۔ وہ آیا تو دیکھا کہ وہی درہم آپ کے ہاتھ میں تھا۔ کہا کہ معیقیبؓ! میں نے تمہارے ساتھ کون سی زیادتی کی تھی جو تم نے مجھ سے اس طرح بدلہ لینا چاہا۔ تم سوچو کہ قیامت کے دن جب اُمّتِ محمدیہ مجھ سے اس درہم کی بابت پوچھے گی تو میں کیا جواب دوں گا۔ (صفحہ ۲۹۵)

اس دیانت اور امانت کا نتیجہ کیا تھا اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایئے۔

جب ایران (مدائن) فتح ہوا تو اس کا مالِ غنیمت مدینہ پہنچا۔ اسے دیکھ کر اہلِ مدینہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ زر و جواہرات، مال و دولت، نوادرات کی اتنی کثرت تھی کہ انسان کا ذہن اسے باور نہیں کرتا تھا۔ حضرت سعد بن وقاصؓ نے اس مال کو بھیجتے وقت جو خط امیرالمؤمنین کو بھیجا تھا اس میں لکھا تھا کہ اس مال کی کثرت یقیناً وجۂ حیرت ہو گی لیکن اس سے بھی باعثِ مسرت امر یہ ہے کہ یہ تمام زر و جواہرات مسلمان سپاہیوں کو ایسے ایسے مقامات سے ملے تھے جہاں انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ لیکن ان میں سے کسی نے ایک سوئی بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ سب کچھ لا کر مرکز میں جمع کرا دیا۔ یہ پڑھ کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور کہا کہ اس قسم کی دیانت اور امانت کی مثال اور کہاں مل سکتی تھی۔

حضرت علیؓ پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا کہ عمرؓ! تمہیں معلوم ہے کہ سپاہیوں کی اس دیانت اور امانت کا راز کیا ہے؟ وہ راز یہ ہے کہ

چونکہ آپ کا دامن پاک ہے اس لئے آپ کی رعایا بھی پاکدامن ہے اگر آپکی نیت ٹھیک نہ ہوتی تو رعایا کی نیت میں بھی فرق آ جاتا۔ (صفحہ ۱۸۲)

سربراہِ مملکت کا کیریکٹر رعایا پر کس قدر اثر انداز ہوتا ہے، اس کا اندازہ اس (عموماً) واقعہ سے لگایئے۔

ایک رات آپ گشت کرتے کرتے تھک گئے تو ایک مکان کے باہر اس کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ سنا تو اندر ایک عورت اپنی لڑکی سے کہہ رہی تھی کہ اٹھو۔ اور دودھ میں تھوڑا سا پانی ڈال دو۔

اس نے کہا۔ اماں! تمہیں معلوم نہیں کہ امیرالمؤمنین نے دودھ میں پانی ملانے سے شدت سے منع کر رکھا ہے۔

ماں نے کہا۔ اٹھ۔ اور دودھ میں پانی ڈال۔ اس جگہ کون سا امیرالمؤمنین تمہیں دیکھ رہا ہے۔ بیٹی نے کہا۔ اماں! امیرالمؤمنین نہیں دیکھ رہا، تو وہ خدا تو دیکھ رہا ہے جس کا حکم امیرالمؤمنین ہم تک پہنچاتے ہیں۔

صبح ہوئی تو آپ نے اپنی بیوی سے کہا کہ جلدی سے جا اور دیکھ کر وہ لڑکی شادی شدہ ہے یا ابھی اس کی شادی ہونی ہے۔ اگر وہ غیر شادی شدہ ہے تو اسے بہو بنا کر گھر لے آ کہ اس قسم کی نعمتیں روز روز نہیں ملا کرتیں۔ معلوم ہوا کہ لڑکی بیوہ ہے۔ آپ نے اپنے بیٹے عاصمؓ سے اس کی شادی کر دی۔

(شاہکار رسالت صفحہ ۱۳۰)

یہی وہ اصول تھا جسے حضرت عمرؓ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے نام اپنے ایک خط میں، ان الفاظ میں رقم فرمایا تھا کہ

یاد رکھو! جب حاکم بگڑ جاتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔ سب سے زیادہ بدبخت وہ شخص ہے جس کی وجہ سے اس کی رعایا بگڑ جائے۔ (صفحہ ۱۲۹)

اور اسی خط میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ

اگر تم یہ جاننا چاہو کہ اللہ کے ہاں تمہارا مقام کیا ہے تو یہ دیکھو کہ اللہ کی مخلوق تمہیں کیا سمجھتی ہے۔ اچھی طرح جان لو کہ اللہ کے ہاں تمہارا مرتبہ وہی ہے جو مخلوق کے ہاں ہے۔ صفحہ ۱۲۹

حضرت عمرؓ نے بطور سربراہ مملکت جو وظیفہ اپنے لئے مقرر کیا وہ حسب ذیل تھا۔

کپڑوں کے دو جوڑے، ایک گرمی کا ایک سردی کا۔ حج اور عمرہ کے لئے ایک ایک احرام۔ میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے۔ نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ اس کے لبعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں۔ جو حال ان کا سو حال میرا۔

ایک دفعہ کوفہ کا عامل آپ سے ملنے آیا تو آپ اسے اپنے ساتھ گھر لے آئے اور اس کے سامنے اندر سے آپ کا کھانا آگیا۔ کھانے میں جو کی روٹی۔ زیتون کا تیل اور موٹا پسا ہوا نمک تھا۔ اس مہمان نے کہا کہ آپ جو کی روٹی کیوں کھاتے ہیں۔ گیہوں کی کیوں نہیں کھاتے؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ

اس وقت عمرؓ کو یقین ہے کہ مملکت میں ہر فرد کو جو کی روٹی مل رہی ہے۔ وہ گیہوں کی روٹی اس دن کھائے گا جس دن اسے اس کا اطمینان ہو جائے کہ ہر شخص کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔

قحط کے زمانے میں آپ نے التزام یہ رکھا کہ ایک مشترکہ دستر خوان ہو۔ جو کچھ میسر آئے سب مل کر کھالیں، انہی میں آپ خود بھی شریک ہوتے۔ آپ اس قسم کی غذا کے عادی نہیں تھے اس لئے آپ کی صحت خراب ہو گئی اور رنگت سیاہ پڑ گئی۔ رفقاء نے کہا کہ آپ

یہ غذا نہ کھایئے۔ آپ نے فرمایا کہ میں یہ غذا اس لئے کھاتا ہوں کہ

اگر مجھ پر وہ کچھ نہ گزرے جو عوام پر گذرتی ہے تو مجھے ان کی تکلیفوں اور پریشانیوں کا احساس کیسے ہو سکتا ہے؟ اور جب مجھے ان کا احساس نہیں ہوگا تو میں انہیں رفع کرنے کی فکر کیسے کر سکوں گا؟

دوسرے مقام پر آپ نے فرمایا کہ

اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دوسرے انسان بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں لوگوں کا اچھا والی نہیں ہوں۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اسلامی مملکت کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریات سے محروم نہیں رہتا۔ عام الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اس میں کوئی شخص رات کو بھوکا نہیں سوتا۔ اس باب میں سربراہ مملکت کی ذمہ داری کس قدر ہے اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے اس اعلان سے لگ سکتا ہے جس نے اب عالمگیر شہرت حاصل کر لی ہے۔ آپ نے فرمایا تھا

اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو قیامت کے دن عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

اسی باز پرس کے احساس کا نتیجہ تھا کہ حضرت عمرؓ دن بھر امور مملکت کی سر انجام دہی میں مشغول رہتے اور راتوں کی تنہائی میں گشت لگا کر معلوم کرتے کہ رعایا کس حال میں ہے

ایک دفعہ آپ گشت کو نکلے۔ شہر سے باہر ایک مقام پر دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچے رو رہے ہیں۔ حقیقت حال معلوم کرنے پر اس نے کہا کہ تین وقت سے بچوں کو کچھ کھانے کو نہیں ملا۔ میں نے خالی ہنڈیا چڑھا رکھی ہے کہ بچوں کا دل بہلا رہے۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم نے امیرالمؤمنین کو اس کی اطلاع دی ہے۔ اس کے جواب میں اس نے جو کچھ کہا اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ اس دور میں عام عورتوں تک حکومت کی ذمہ داریوں کو کس حد تک جانتی تھیں۔ اس نے کہا کہ

جو شخص حاکم ہو کر رعایا کے حالات سے بے خبر ہے اس تک شکایت پہنچانے سے کیا حاصل!

سوچئے کہ اس سے عمر فاروقؓ کے دل پر کیا گذری ہوگی! آپ اٹھے، بیت المال سے آٹا، گھی، کھجوریں لیں اور اپنے معاون اسلم سے کہا کہ انہیں میری پیٹھ پر لاد دو۔ اسلم نے کہا کہ مجھے دیجئے۔ میں لئے جاتا ہوں۔ فرمایا کہ اسلم! اس معاملہ کا تعلق قیامت سے

ہے اور قیامت میں تم میرا بوجھ نہیں اٹھاؤ گے۔ اس لئے یہ بوجھ مجھے خود ہی اٹھانے دو۔ یہ چیزیں لاکر اس عورت کو دیں۔ اس نے ہانڈی چڑھائی تو آپ چولہا پھونکتے رہے کھانا تیار ہوا۔ بچوں نے سیر ہو کر کھایا اور اچھلنے کودنے لگے۔ حضرت عمرؓ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ چلنے لگے تو اس عورت نے کہا کہ خدا تمہیں جزائے خیر دے امیر المؤمنین ہونے کے قابل تم تھے نہ کہ عمرؓ۔

فی الحقیقت امیر المؤمنین ہونے کے قابل یہی تھے اور یہیں سے ہمارے سامنے وہ واقعہ آجاتا ہے کہ جب بھی عمرؓ اسے یاد کرتے، آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ آپ شام کے سفر سے واپس آرہے تھے تو راستے میں ایک خیمہ دیکھا۔ ویرانے میں ایک خیمہ! قریب گئے تو دیکھا کہ اس میں ایک بڑھیا بیٹھی ہے۔ پوچھا کہ تمہیں عمرؓ کا بھی کچھ حال معلوم ہے۔

شام کے ویرانے کی بڑھیا

اس نے کہا کہ سنتا ہے کہ وہ شام سے چل پڑا ہے۔ اس سے زیادہ نہ مجھے اس کی بابت کچھ علم ہے، نہ معلوم کرنے کی ضرورت۔ آپ نے پوچھا کہ ایسا کیوں؟ اس نے کہا کہ جس نے آج تک یہ معلوم نہیں کیا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے، میں اس کے حالات معلوم کر کے کیا کروں گی؟ آپ نے کہا کہ تم نے عمرؓ تک اپنی حالت کی اطلاع پہنچائی تھی! اس نے کہا کہ یہ میرا کام نہیں تھا، عمرؓ کا کام تھا۔ آپ نے کہا کہ عمرؓ کو اتنی دور کا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے! اس کے جواب میں اس بڑھیا نے جو کچھ کہا وہ غور سے سننے کے قابل ہے اس نے کہا کہ

> اگر عمرؓ اپنی رعایا کے ہر فرد کے حالات کا علم نہیں رکھتا تو اسے حکومت کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔

حضرت عمرؓ جب بھی اس واقعہ کو یاد کرتے آنکھوں میں آنسو آجاتے اور کہتے کہ خلافت کا مفہوم کیا ہے، مجھے شام کی بڑھیا نے بتایا۔

> خداوندا! خدائی دردِ سر ہے

اسی کا احساس تھا کہ آپ نے ایک دفعہ فرمایا کہ

> اگر میں زندہ رہا تو رعایا کا حال معلوم کرنے کے لئے سال بھر تک مسلسل سفر میں رہوں گا۔ کیونکہ دور دراز علاقوں کے لوگ مجھ تک پہنچ نہیں سکتے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے عمال، ان میں سے ہر ایک کی ضروریات سے مجھے آگاہ کرتے ہوں۔ میں شام، جزیرہ، مصر، بحرین، بصرہ، جاؤں گا اور ہر مقام پہ دو دو ماہ قیام کر کے لوگوں کے حالات براہِ راست معلوم کروں گا۔

ہمارے ہاں آج کل حدود آرڈیننس کے تحت سزاؤں کا بڑا چرچا ہے۔ جب یہ قوانین نافذ ہوئے تھے تو بیرونی ممالک کے بعض دانشوروں نے انہیں بڑے وحشیانہ قوانین قرار دیا تھا اس کے جواب میں صدرِ مملکت نے کہا تھا کہ ان کے ساتھ شرائط ایسی وابستہ ہیں کہ ان کی رُو سے جرم کا ثابت ہونا ناممکن نہیں تو بعید (مشکل) ہوگا اس لئے ہزاروں میں سے شاید کسی ایک کو سزا مل سکے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس کا کیا جواب دیا تھا اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے جو بڑا مشہور ہے۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے اسلامی مملکت میں افرادِ معاشرہ کے رزق کی ذمہ داری مملکت کے سر تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً انتظام یہ تھا کہ ملازموں کے کھانے پینے کی ذمہ داری ان کے مالکوں پر تھی۔ لیکن اس میں ایک سقم نظر آیا۔ یہ سقم حاطب ابن ابی بلتعہؓ کے (ملازموں) کے واقعہ میں سامنے آیا جو جرم و سزا کے فلسفے کے سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہوا یوں کہ ان کے ملازموں نے ایک شخص کا اونٹ چرا کر، ذبح کر کے کھا لیا۔ ان کے خلاف چوری کا جرم ثابت ہوگیا۔ آپ نے حد (سزا) نافذ کرنے سے پہلے ان سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے کہا کہ حاطب ہم سے سخت کام لیتا ہے لیکن کھانے کو اس قدر کم دیتا ہے کہ اس سے ہمارا پیٹ نہیں بھرتا۔ ہم نے انتہائی مجبوری کے عالم میں ایسا کیا ہے۔

یہ سن کر آپ نے ان ملازموں کو تو معاف کر دیا اور حاطب کو بلا کر کہا کہ چاہیئے تو یہ کہ چوری کے جرم کی سزا میں تمہارا ہاتھ کٹوا دیا جائے کہ اس جرم کے مرتکب تمہارے ملازم نہیں، تم ہو جس نے انہیں اس حالت تک پہنچا دیا کہ وہ چوری کرنے پر مجبور ہوگئے۔ لیکن میں تم سے نرمی برتتا ہوں۔ اس دفعہ تو اتنی سزا ہی کافی سمجھتا ہوں کہ تم اونٹ کی قیمت اس کے مالک کو ادا کر دو۔ اگر آئندہ تمہارے ملازموں کی یہی حالت ہو گئی تو پھر تمہارے لئے کسی سخت سزا کا سوچا جائے گا۔

اس فیصلہ سے جرم و سزا کے معاملہ میں بڑے دور رس نتائج مستنبط ہوتے ہیں۔ یعنی یہ سزا بس اسی وقت دی جا سکتی ہیں جب ہر فردِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی پوری ہو رہی ہوں۔ اس کے لئے آپ نے تمام افرادِ معاشرہ کے وظائف مقرر کر دیئے۔ خوراک ہر ایک کو بیت المال کے مودی خانہ سے ملتی تھی۔

حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ درحقیقت قرآن کریم کے ایک اصول کی عملی تشریح تھی۔ یہودیوں کی حالت یہ تھی کہ وہ اپنے ہاں کے کمزور اور غریب افراد کو اس قدر تنگ کرتے کہ وہ گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے۔ وہ گھر بار چھوڑ کر نکل جاتے تو دوسرے لوگ انہیں گرفتار کر کے قیدی بنا لیتے۔ یہودی شریعت میں زرِ فدیہ ادا کر کے قیدیوں کو چھڑانا بڑے ثواب کا کام قرار دیا جاتا تھا۔ چنانچہ وہی لوگ جنہوں نے

ان غریبوں کو باہر نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چندے جمع کر کے انہیں چھڑا لاتے۔ قرآن کریم نے اس پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ تم ان قیدیوں کو چھڑانے کو تو ثواب کا کام سمجھتے ہو، لیکن اس پر غور نہیں کرتے کہ انہیں ان کے گھروں سے نکال باہر کرنا کس قدر سنگین جرم تھا! (۲/۸۵)

اس سے یہ عظیم اصول مستنبط ہوتا ہے کہ معاشرہ میں ایسے حالات پیدا کر دینا جس سے لوگ مفلس اور غریب ہو جائیں اور پھر ان غریبوں کو صدقہ خیرات دے کر سمجھنا کہ ہم بڑا نیکی کا کام کر رہے ہیں، خود فریبی اور خدا فریبی ہے۔ اصل نیکی یہ ہے کہ معاشرہ میں ایسے حالات پیدا ہی نہ ہونے دیئے جائیں جن سے لوگ ضروریاتِ زندگی سے محروم ہو کر بھیک مانگنے یا قانون شکنی کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ حضرت عمرؓ نے اس سے یہ اصول مستنبط فرمایا تھا کہ ان حالات میں مجرم وہ لوگ نہیں ہوتے جو ارتکابِ جرم کرتے ہیں، مجرم وہ ہوتے ہیں جو ایسے حالات پیدا کرتے ہیں جو ان لوگوں کو ارتکابِ جرم کے لئے مجبور کر دیتے ہیں۔ اگر ہر شخص کی ضروریاتِ زندگی بہ اطمینان پوری ہوتی جائیں اور اس کے باوجود کوئی شخص چوری کرے تو سخت سے سخت سزا دیجئے۔ معاشرتی جرائم اور معاشی نظام کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

اسلامی نظام میں افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی صدقہ و خیرات کے ذریعے پوری نہیں کی جاتی تھیں۔ ذاتی صدقہ و خیرات اس دور کی بات ہے جب اسلامی نظام وجود میں نہ آیا ہو۔ اسلامی نظام میں ہر فرد اپنی ضروریاتِ زندگی بطور اپنے حق کے حاصل کرتا ہے، اس سے اس کی عزتِ نفس محفوظ رہتی ہے۔ اسلامی نظام خلافت میں تکریم آدمیت بنیادی اصول ہے۔ یہ تکریم مسلمانوں تک محدود نہیں تھی۔ قرآن مجید نے ہر بنی آدم (انسان) کو واجب التکریم قرار دیا ہے۔ اس میں اپنے اور بیگانے، مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں۔ اس باب میں قرآنی تعلیم اور تربیت نبویؐ نے ان حضرات میں کیا تبدیلی پیدا کر دی تھی، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایئے کہ ایک دفعہ حمص کے حاکم (حضرت عمیرؓ بن سعد) کی زبان سے ایک ذمی (محکوم، غیر مسلم رعایا کے فرد) کے متعلق یہ الفاظ نکل گئے۔ اخزاک اللہ۔ خدا تجھے رسوا کرے۔ اس پر انہیں اس قدر ندامت اور تاسف ہوا کہ سیدھے بابِ خلافت میں پہنچے اور یہ کہہ کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں اپنا استعفیٰ پیش کر دیا کہ میں نے ایک انسان کی تذلیل کی ہے اس لئے میں اس منصب کا اہل نہیں۔

مصر کے گورنر حضرت عمروؓ بن عاص نے ایک دفعہ ایک شخص کو منافق کہہ دیا۔ حضرت عمرؓ

نے فرمایا کہ اس سے زیادہ اس کی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے۔ ان سے کہا کہ اس شخص سے معافی مانگ کر اسے راضی کر لو ورنہ میں آپ کو سزا دے دوں گا۔

نماز، روزہ، وغیرہ اسلامی نظام کے بڑے اہم عناصر ہیں، ان کی ادائیگی سے انسانی سیرت میں پختگی اور اس کے کردار میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔ اگر ان فرائض کی ادائیگی سے ایسا نہیں ہوتا تو پھر انکی حیثیت محض رسومات کی رہ جاتی ہے۔ لہذا، اسلامی نظام میں حقیقی معیار، فرد کا کیریکٹر ہے۔ اس اصول پر حضرت عمرؓ کی نگاہ کس قدر گہری تھی اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ

ایک دفعہ ایک شخص سے آپ نے کہا کہ اپنی بات کی تائید کے لئے کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو اعتماد کے قابل ہو۔ اس نے ایک آدمی کا نام لیا تو آپ نے اس سے پوچھا کہ

کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے ؟

اس نے کہا۔ نہیں۔

پھر پوچھا۔ کیا تم کبھی اس کے ہمسایہ رہے ہو؟

اس نے کہا۔ نہیں

آپ نے پھر پوچھا کہ

کیا اس کے ساتھ تمہارا کوئی معاملہ پڑا ہے ؟

جب اس نے اس پر بھی کہا کہ نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ

پھر تم اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں سر جھکاتے، سر اٹھاتے دیکھ لیا ہوگا۔ اور اس سے سمجھ لیا کہ وہ قابل اعتماد ہے۔

ایک دفعہ کسی نے کہا کہ مومن کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ آپ نے فرمایا کہ بات مکمل کرو۔ مومن نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے، نہ دھوکا کھاتا ہے۔

یہ تھی سربراہ مملکت کی سیرت و کردار کی تابندگی جس سے خلافت اور ملوکیت کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجاتا تھا۔ یہ فرق عام مسلمانوں کے ذہن میں بھی اس قدر واضح تھا کہ جب روم کے سفیر نے ان سے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کہاں ہے؟ تو اسے جواب ملا کہ، "ما لنا ملک۔ بل لنا امیر۔" ہمارا کوئی بادشاہ نہیں، ہمارا صرف امیر ہے ـــــ اور سامعین کو معلوم ہوگا کہ امیر کے معنی ہیں صحیح راستے کیطرف راہنمائی کرنے والا، نہ کہ حاکم۔ اسلام میں کوئی انسان حاکم ہوتا ہی نہیں۔

اس کے بعد وہ اس سربراہِ مملکت (حضرت عمرؓ) کی تلاش میں نکلا، تو دیکھا کہ آپ

اپنے جُبّے کو سر کے نیچے رکھے، بالو ریت پر دھوپ میں سو رہے ہیں، اور آپ کا پسینہ پیشانی سے ٹپک کر زمین کو تر کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ ورطۂ حیرت میں گم ہو گیا اور بے ساختہ پکار اٹھا کہ

عمرؓ! تو لوگوں سے عدل کرتا ہے اس لئے اس طرح بے خوف سوتا ہے۔ ہمارا بادشاہ ظلم کرتا ہے اس لئے وہ بیدار اور خوفزدہ رہتا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرا دین برحق ہے۔ اگر میں قاصد کی حیثیت سے نہ آیا ہوتا تو اسی وقت اسلام قبول کر لیتا۔ اب میں جا کر واپس آؤں گا تو اسلام قبول کر لوں گا۔

عزیزانِ من!

اس درس کے اعلان سے آپ نے دیکھا ہو گا کہ اس کا موضوع تھا

بے نیازی سے تیری ناز اٹھائے گیا کیا　　جو نہ چاہا وہ ہوا، اور جو چاہا نہ ہوا

مبداءِ فیض سے بس اتنا گلہ ہے مجھ کو　　جو نہ مانگا وہ ملا، اور جو مانگا نہ ملا

میں نے آغازِ درس میں واضح کیا تھا کہ مطالبہ پاکستان سے مقصود اس اسلام سے نجات حاصل کرنا تھا جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا اور شخصی حکومت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری جس کے ستون تھے۔ اور اس اسلام کی جگہ اس مملکت کا قیام تھا جس کی ایک خفیف سی جھلک میں اس قلیل وقت میں پیش کر سکا ہوں۔ اس کے بعد آپ خود فیصلہ فرما لیجئے کہ ہم نے جو کچھ چاہا تھا، کیا وہی ہوا ہے اور جو کچھ مانگا تھا کیا وہی ملا ہے، یا اس کے برعکس ہوا ہے۔ اس کا جو نام آپ رکھنا چاہتے ہیں رکھ لیجئے۔ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی!

جنتی زندگی کے متعلق تو بہرحال ارشادِ باری تعالےٰ یہی ہے۔ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ (۴۱/۳۱) اس میں تم جو چاہو گے وہ ہو گا۔ جو مانگو گے وہ ملے گا۔

والسلام

خریدار صاحبان متوجہ ہوں

(۱) بسا اوقات ادارہ ہذا کے نام جو منی آرڈر موصول ہوتے ہیں ان کے کوپن (Coupons) پر خریدار کا مکمل پتہ نہیں لکھا ہوا ہوتا۔ اس کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ تعمیل میں بلا وجہ تاخیر نہ ہو۔

(۲) پرچہ نہ ملنے کی اطلاع خریدار ماہ رواں کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں۔ اس صورت میں ہی پرچہ دوبارہ ارسال کیا جائیگا

(۳) جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ ارسال کریں۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

تبویب القرآن

(۱) آپ کے ذہن میں کوئی سوال آئے اور آپ معلوم کرنا چاہیں کہ اس کی بابت قرآن مجید نے کیا کہا ہے، اور کہاں کہاں کہا ہے، تو اس کتاب سے آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا۔

(۲) اس کتاب میں اس قسم کے قریب دو ہزار چار سو عنوانات ہیں، اور ہر عنوان کے تحت اُن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں اس کے متعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ قرآنِ مجید میں کچھ کہا گیا ہے۔ اِس سے آپ اس کتاب کی وسعت کا اندازہ لگا لیجئے۔ یہ، مفکرِ قرآن کی قریب چالیس (۴۰) سال کی محنتِ شاقہ کا ماحصل ہے۔

(۳) کتاب بڑے سائز کے ۱۵۱۲ صفحات پہ پھیلی ہوئی ہے۔ عمدہ سفید کاغذ۔ ادفسٹ کی چھپائی۔ تین مضبوط اور دیدہ زیب جلدوں میں۔ تازہ ایڈیشن حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اسکی قیمت دوسو پچاس (۲۵۰) روپے اور محصول ڈاک پندرہ (۱۵) روپے ہے۔ چونکہ کتاب مکمل سیٹ ہی میں کارآمد ہو سکتی ہے اس لئے اسکی الگ الگ جلدیں مہیا نہیں کی جاتیں۔

ملنے کا پتہ

(۱) مکتبہ دین و دانش چوک اُردو بازار لاہور (۲) ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

(مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم)

ہندو اور انگریز، دونوں، مطالبہ اور تحریکِ پاکستان کے مخالف تھے۔ لیکن ان کی مخالفت نے اس تحریک کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا نقصان کانگریسی علماء نے پہنچایا اول الذکر سیاسی سطح پر گفتگو کرتے تھے، جس کی مدافعت اور تردید جناح جیسے مفکر اور ماہرِ سیاست کے لئے کچھ مشکل نہ تھی۔ لیکن علماء حضرات، "قال اللہ اور قال الرسول" کے نقاب میں مزاحمت کرتے تھے جس سے مسلمان عوام بہت جلد متاثر ہو جاتے تھے۔ ان علماء میں بیشتر وہ تھے جن کا تعلق دارالعلوم (یا تحریک) دیوبند سے تھا۔ طلوعِ اسلام میں ان کی سازشوں اور سرگرمیوں کے متعلق بڑی تفصیل سے لکھا گیا (اور لکھا جا رہا) ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ ان علماء کے سرغنہ (مولانا) حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید وغیرہ (مرحوم) قائداعظمؒ کے زیرِ قیادت، مسلم لیگ کے ہمنوا تھے لیکن جب ان کا پچاس ہزار روپے کا مطالبہ پورا نہ ہوا تو وہ کانگریس کے ساتھ جا ملے۔ اور (باقی) ساری عمر ان کی مخالفت میں گذار دی۔ قائداعظمؒ پر کفر کے فتوے لگائے اور مسلم لیگ میں شرکت کو از روئے اسلام ناجائز قرار دیا

لیکن ان سے بھی زیادہ نقصان ایک اور شخص نے پہنچایا۔ اور وہ تھے (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) ان کی شخصیت عجیب و غریب تھی جس خصوصیت نے انہیں (اپنے ہمعصر علماء میں) منفرد حیثیت عطا کر دی تھی، وہ ان کا فنِ خطابت تھا اقبالؒ نے تو (مولانا) مدنیؒ کے متعلق کہا تھا کہ۔ نقیبہ شہر قارون ہے، لغت ہائے حجازی کا۔ لیکن، در حقیقت، اس کا صحیح اطلاق مولانا آزاد پر ہوتا ہے۔ عربی مرادفات کا سیلاب تھا جو ان کی تقریروں اور تحریروں میں اُمنڈے چلا آیا کرتا تھا۔ اگرچہ ان میں حقائق کم اور الفاظ زیادہ ہوتے تھے، لیکن مسلمانوں جیسی جذباتی قوم کے لئے اس سے زیادہ سحر انگیز ذریعہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے ۱۹۱۲ء میں (جبکہ ان کی عمر بمشکل تیئیس چوبیس سال کی تھی) اپنا ہفت روزہ جریدہ "الہلال" جاری کیا جس سے اس زمانے کے میدانِ صحافت میں ان کی دھاک بیٹھ گئی۔

دورِ الہلال

ہندوستان کے مسلمانوں کو شروع ہی سے، دیگر ممالک کے مسلمانوں کے ساتھ بالعموم، اور ترکوں کے ساتھ بالخصوص، بڑی ہمدردی ہوتی تھی (اور گو اتنی

شدید نہیں، لیکن باہں ہمہ، اب تک ہے) سنہ ۱۹۱۱-۱۲ء کی جنگ بلقان میں مسلمانوں پر مصائب و نوائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے، اور ترکوں کو بالخصوص بڑی مشکلات کا سامنا تھا، (مولانا) آزاد نے، ایمان کے اشتراک کی بناء پر مسلمانوں کی عالمگیر برادری اور وحدت امت جیسے بنیادی مسائل کو اپنی تحریروں کا مرکز قرار دیا اور اسطرح ان کی مقبولیت دور دور تک پھیل گئی۔ طلوعِ اسلام اپنے دورِ اوّل میں "الہلال" کے اس زمانے کی اکثر و بیشتر تحریروں کے اقتباسات پیش کیا کرتا تھا۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔ ان کا غور سے مطالعہ کیجئے کیونکہ آگے چل کر انہی کی روشنی میں مولانا آزاد کی زندگی کا حسرت آمیز اور تاسف انگیز تضاد سامنے آئے گا۔ انہوں نے لکھا تھا۔

یہ (مسلمانوں کی) برادری خدا کی قائم کی ہوئی ہے ہر انسان جس نے کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کیا بمجرد اقرار کے اس برادری میں شامل ہو گیا۔ خواہ وہ مصری ہو خواہ الجیریا کا وحشی۔ خواہ قسطنطنیہ کا تعلیمیافتہ ترک۔ لیکن اگر وہ مسلم ہے تو اس ایک خاندانِ توحید کا عضو ہے جس کا گھرانہ کسی خاص وطن اور مقام سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ تمام دنیا اس کا وطن اور تمام قومیں اس کی عزیز ہیں۔ دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں، مگر یہ رشتہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

اس سے بھی واضح تر الفاظ ہیں۔

ہمارے ملکی بھائی (یعنی ہندو) اپنے اندر صرف قومیت اور سیاست کی روح پیدا کر کے زندگی کی حرارت پیدا کر سکتے ہیں۔ اس طرح اور قومیں بھی۔ لیکن مسلمانوں کی تو کوئی ایسی قومیت نہیں جو کسی خاص نسل و خاندان یا زمین کی جغرافیائی تقسیم سے تعلق رکھتی ہو۔ ان کی ہر چیز مذہب یا بالفاظ مناسب تر ان کا تمام کاروبار صرف خدا سے ہے۔ پس جب تک وہ اپنے تمام اعمال کی بنیاد مذہب کو قرار نہیں دیں گے اس وقت تک ان میں نہ قومیت کی روح پیدا ہو سکے گی نہ وہ اپنے بکھرے ہوئے شیرازے کو جمع کر سکیں گے۔ آج دنیا "قوم" اور "وطن" کے نام میں جو تاثیر دیکھتی ہے، مسلمانوں کے لئے وہ صرف "اسلام" یا خدا کے لفظ میں ہے۔

متحدہ قومیت کی علمبردار کانگریس میں شرکت کے متعلق انکا اعلان تھا کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل و اعتقاد کے لئے بھی اس کتاب

کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا راہنما بنائے وہ مسلم نہیں بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم اور اس لئے مشرک ہے۔ اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اسکے پیروؤں کو پولیٹیکل پالیسی قائم کرنے کے لئے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر نیا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں۔

غیر مسلموں سے تعلقات استوار کرنے کے سلسلہ میں وہ کہا کرتے تھے کہ

کفار سے مسلمانوں کو ساز باز نہ رکھنی چاہیئے۔ ان سے بے تعلق ہونا لازم ہے۔ جو ساز باز رکھتے ہیں۔ جنہیں ان سے بے تعلق رہنے میں اپنے اور اپنی قوم کے لئے مشکلات اور مصائب کا اندیشہ ہے، وہ غلطی پر ہیں۔ ان کو پشیمان ہونا پڑے گا۔ اسلام کو فتح نصیب ہوگی اور مسلمانوں کی بہبود و بہتری کا قدرت کاملہ کوئی اور انتظام کر دے گی۔

انہی اقتباسات سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ اس زمانے میں (مولانا) آزاد کے نزدیک اسلام کا معیارِ قومیت کیا تھا؟ یہ وہی تھا جس پر مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اٹھائی گئی تھی۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں حکومت نے (مولانا) آزاد کو قید کر دیا۔ جب وہ سنہ ۱۹۱۹ء میں رہا ہو کر آئے ہیں تو ملک میں تحریک خلافت کا زور تھا۔ مولانا آزاد اس تحریک کے سرگرم زعماء کے زمرے میں شریک ہو گئے۔ طے یہ پایا کہ خلافت

امام الہند

کانفرنس منعقد کی جائے اور اس میں مولانا کو "امام الہند" منتخب کر لیا جائے۔ قوم کی بدقسمتی کہ کانفرنس میں اس کی مخالفت ہو گئی، اور مولانا قوم کی طرف سے دل برداشتہ ہو گئے۔ ہندو بنیا کی کاروباری حس بڑی تیز ہوتی ہے۔ اس نے اس "متاع گران بہا" کو (جو مسلمانوں کی منڈی میں کاسد قرار پا چکی تھی) لپک کر اٹھایا، سر آنکھوں پر بٹھایا اور دنیا کیا دیکھتی ہے کہ مولانا مرحوم سنہ ۱۹۲۳ء میں آل انڈیا کانگریس کے صدر منتخب کر لئے گئے ہیں۔ وہ کانگریس کی تاریخ میں سب سے کم عمر صدر تھے۔ اسے قوم کی بدنصیبی کے سوا کیا کہا جائے گا کہ مولانا مدنی (وغیرہم) محض پچاس ہزار روپے نہ ملنے پر مخالفین کی صف میں چلے گئے اور مولانا آزاد نے امام الہند منتخب نہ ہونے پر ماتھے پر قشقہ لگا لیا۔ مولانا آزاد لباطِ

سیاست کے بڑے ذہین مہرہ باز تھے۔ (انہیں اگر مغربی زبانوں، بالخصوص انگریزی پر بھی ویسا ہی عبور ہوتا تو ان کا شمار دورِ حاضر کی میکیاولی سیاست کے ماہرین میں ہوتا) ہندو نے ان کی ذہانت اور فطانت کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ لیگ اور کانگریس کی کشاکش کے نازک ترین مراحل پہ انہیں مسلمانوں کے مقابل لاکھڑا کیا کرتے تھے۔ مثلاً لیگ اور کانگریس کی کشمکش میں صوبہ پنجاب کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ایک وقت ایسا آگیا تھا کہ لیگ بڑے نازک مرحلہ سے گذر رہی تھی، سوال منسٹری کی تشکیل کا تھا۔ کانگریس 'یونینسٹ پارٹی کو آگے بڑھا کر لیگ کو شکست دینا چاہتی تھی، لیکن اسے لیگ کی پوزیشن مستحکم دکھائی دیتی تھی۔ ایسے نازک مرحلہ پہ اس نے مولانا آزاد کو پنجاب بھیجا۔ وہ اپنی کتاب (INDIA WINS FREEDOM) میں بڑے فخر سے لکھتے ہیں۔

> میں نے مسلمانوں کے دونوں گروہوں سے بات چیت کی۔ مسٹر جناح نے لیگی ممبروں کو میری دعوت پہ لبیک کہنے سے روک دیا تھا۔ بایں ہمہ میں نے ایسے انداز سے باتیں کیں جن سے یونینسٹ پارٹی کو، کانگریس کی تائید سے، منسٹری قائم کرنے کا موقعہ مل گیا۔ کانگریس کو پنجاب میں حکومت قائم کرنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ (صفحہ ۱۲۵)

عجیب اتفاق ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے مولانا آزاد کی اس حکمتِ عملی کی مخالفت کی۔ اس پر مولانا (مرحوم) لکھتے ہیں۔

> پنڈت نہرو کے اس ردِّ عمل سے مجھے حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ میں نے پنجاب میں کانگریس کی حکومت قائم کرادی تھی حالانکہ گورنر اس کا مخالف تھا اور چاہتا تھا کہ وہاں مسلم لیگ کی حکومت قائم ہو جائے۔ میری کوششوں سے مسلم لیگ بے یار و مددگار رہ گئی اور پنجاب میں کانگریس فیصلہ کن حقیقت بن گئی حالانکہ وہ وہاں اقلیت میں تھی۔ کانگریس کی تائید سے خضر حیات خان چیف منسٹر بن گیا۔ وہ فطری طور پر کانگریس کے زیر اثر تھا (صفحہ ۱۲۸)

یہ کچھ تھا جو کانگریس مولانا آزاد سے کرایا کرتی تھی۔ اسے یہ سودا مہنگا نہیں پڑا تھا!

متحدہ قومیت کا علمبردار

مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد (اسلام کے اس اصول پر) تھی کہ مسلمان، ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک منفرد اور جداگانہ قوم ہیں۔ اور جغرافیائی بنیادوں پر متحدہ قومیت اسلام کی نقیض ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ الہلال کے زمانے میں، مولانا آزاد، اسلام

کے اس اساسی اصول کے سب سے بڑے داعی اور نقیب تھے۔ اب دینی مولانا اس کے سب سے بڑے مخالف تھے۔ اس ضمن میں ان کی تقریروں اور تحریروں کے متعدد اقتباسات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ہم چند ایک پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۱) انہوں نے اگست ۱۹۴۵ء میں ایک سوال کے جواب میں کہا:

میں تقسیم ملک کے خلاف ہوں۔ اول رجہ مذہبی بنا دپر ہے۔ اسلام ایک تبلیغی دین ہے۔ اور ہر مسلمان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلام اور اللہ تعالیٰ کا پیغام ہر غیر مسلم تک پہنچائے اور اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا راستہ اس کو دکھائے۔ ہندوستان کی آبادی چالیس کروڑ انسانوں پر مشتمل ہے جس میں دس کروڑ مسلمان اور تیس کروڑ غیر مسلم ہیں۔ ان دس کروڑ مسلمانوں میں سے ہر ایک مسلمان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا راستہ ان کو دکھائے۔ یہ ایک ایسا فرض ہے جس سے کوئی بھی مسلمان پہلو تہی نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی اس فرض سے اس کی گلوخلاصی ہو سکتی ہے۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے۔ اور یہاں ہر مسلمان کے لئے اپنا فرض پورا کرنے کا موقع ہے۔ تقسیم کے بعد مسلمان غیر مسلموں سے الگ ہو جائیں گے اور اس دینی فرض کو پورا کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ جو ایک نہایت ہی بدقسمتی ہوگی۔ میں بہ حیثیت ایک مسلمان کے اس بدقسمتی کو دیدہ دانستہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔

(طلوعِ اسلام اگست ۱۹۸۱ء صفحہ ۲۶)

اس کے ساتھ ہی ایک طنز کا نشتر بھی ملاحظہ فرمائیے۔

میری مخالفت کی دوسری وجہ سیاسی ہے۔ یہ تقسیم، ہندوستان کو کمزور بنانے کے لئے کی جا رہی ہے۔ تقسیم سے ملک اور قوم دونوں بٹ جائیں گے اور تقسیم شدہ دونوں حصے کمزور ہو جائیں گے۔ چھوٹا حصہ تو رہا ایک طرف، بڑا حصہ بھی موجودہ ہندوستان سے کمزور ہوگا۔ لیکن بات کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ یہ نہ آپ کے اختیار میں ہے اور نہ میرے بس میں۔ یہ فیصلہ کسی اور نے کیا ہے اور اس قسم کے فیصلے وہ پہلے بھی کر چکا ہے۔ اور ہندوستان کے ٹکڑے بکھرے پہلے ہی ہو چکے ہیں۔ برما اور سیلون پہلے ہی ہندوستان سے جدا کئے گئے ہیں۔ میں ان دو وجوہات کی بناء پر ملک کی تقسیم کے خلاف ہوں۔

تقسیم کے خلاف

(طلوعِ اسلام اگست ۱۹۸۱ء صفحہ ۲۷)

(۲) انہوں نے اپریل ۱۹۴۶ء میں ایک بیان جاری کیا جس میں پہلے کہا ! مجھے اعتراف ہے کہ پاکستان کی اصطلاح ہی میری روح کے خلاف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کرۂ ارض کے بعض حصے پاک ہیں اور باقی ناپاک۔ زمین کے مختلف خطوں کی "پاک اور ناپاک" کی یہ تقسیم یکسر غیر اسلامی اور اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ اسلام اس قسم کی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا۔ نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ "خدا نے پورے کرۂ ارض کو میرے لئے مسجد بنایا ہے"۔

(طلوع اسلام اپریل ۱۹۸۳، صفحہ ۲۳)

اور اس کے بعد کہا :

آیئے ! ذرا جذبات سے ہٹ کر سوچیں کہ اگر پاکستان کی اسکیم عمل میں آگئی تو اس کے نتائج اور عواقب کیا ہوں گے۔ اس سے ہندوستان دو مملکتوں میں بٹ جائے گا۔ ایک میں مسلمان اکثریت میں ہوں گے اور دوسری میں ہندو۔ ہندوستانی مملکت میں قریب ساڑھے تین کروڑ مسلمان رہ جائیں گے جو مختلف گوشوں میں اقلیت کی حیثیت سے بکھرے ہوں گے .....
ان علاقوں میں انہوں نے ہزار سال سے اپنے مساکن تعمیر اور مسلم ثقافت اور تہذیب کے مراکز قائم کئے تھے۔ وہ ایک صبح اٹھیں گے اور معاشیات میں (ہندوؤں سے) بہت پیچھے ہوں گے اور اپنے آپ کو اس مملکت کے رحم و کرم پر محسوس کریں گے جس میں اس وقت خالصتہً ہندو راج ہوگا۔

(طلوع اسلام اپریل ۸۳ء، صفحہ ۲۳)

دس سال کے بعد انہوں نے اپنی مذکورہ کتاب میں کہا تھا کہ جو کچھ میں نے اس زمانے میں کہا تھا، اس سے آج بھی حرف بحرف متفق ہوں۔ (کتاب صفحہ ۱۴۲-۴۳)[1]

(۳) پاکستان اگست ۱۹۴۷ء میں وجود میں آگیا۔ انہوں نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جامع مسجد (دہلی) میں ہندوستان کے مسلمانوں کے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا :

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ (دو قوموں کا) نظریۂ حیات مسلمانوں کے لئے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کر رکھا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں ..... تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا غول تھا ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا جو صفحہ ہستی سے محو ہوجانے والی

---

[1] INDIA WINS FREEDOM P.P-142-43

قوموں کا ہوا کرتا ہے .... مجھے آج جو کچھ کہنا ہے، اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں۔ متحدہ ہندوستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا..... ہندوستان کے مسلمانوں پر مصیبتوں کا جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں کا بدیہی نتیجہ ہے۔

(طلوع اسلام اپریل رمئی ۱۹۵۸ صفحہ ۱۵۲)

(۴) ایک قدم آگے بڑھئے۔ انہوں نے ان مسلمانوں سے جو ہندوستان میں رہ گئے تھے ۲۱ جنوری سنہ ۱۹۴۸ء کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔

ہندوستان میں ہر شہری، بلاتمیز فرقہ، یکساں حقوق کا مستحق ہوگا، لیکن جو شخص ابھی تک مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا عقیدہ رکھتا ہو، اس کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں۔

(ڈان مورخہ ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۴۸ء بحوالہ طلوع اسلام جنوری فروری ۱۹۴۸ء)

ہندو جانتا تھا کہ مولانا (مرحوم) کے کریکٹر کا کمزور پہلو ان کی انا کا سوال ہے۔ وہ اپنی انا کی شکست کا بدلہ لئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ جب مسلمانوں نے انہیں "امام الہند" تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا، تو انہوں نے کسطرح اس قوم کو چھوڑ کر ہندوؤں کی آغوش میں پناہ لے لی تھی۔ وہ (ہندو) اس قسم کے مواقع پیدا کرتے رہتے تھے جن میں مولانا (مرحوم) کی انا کو ٹھیس لگے اور وہ اپنی مخالفت میں اور متشدد ہو جائیں سنہ ۱۹۴۰ء میں لیگ کا مشہور اجلاس لاہور میں منعقد ہوا جس کی صدارت قائداعظمؒ فرما رہے تھے۔ ہندوؤں نے رام گڑھ میں کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد کیا اور اس کا صدر مولانا آزاد کو منتخب کر لیا۔

قبل اس کے کہ ہم اس نقطہ کی طرف آئیں جس کے لئے اس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے، یہ دیکھئے کہ مولانا (مرحوم) اپنی ہندو نوازی میں کہاں تک آگے بڑھ چکے تھے۔ اس کا اندازہ ان کلمات تحسین و ستائش سے لگایئے جو انہوں نے مسٹر گاندھی کی شان میں کہے تھے۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا:

وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا ایک ہی روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو تھکنے نہیں دیتا۔

یہ اس شخص (مسٹر گاندھی) کے متعلق کہا جا رہا تھا جو بڑے فخر سے اعلان کیا کرتا تھا کہ میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں اور اپنشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں

تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں گؤ رکھشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ میرے جسم کا رواں رواں ہندو ہے۔

(بحوالہ خطبۂ صدارت قائد اعظمؒ مسلم لیگ سیشن دلی اپریل ۱۹۴۳ء)

(طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۷۹ء صفحہ ۲۴)

یہ تھے "وہ گاندھی جی" جن کی شان میں مولانا آزاد نے وہ کچھ فرمایا تھا۔ اور اس کے تقابل کے لئے دورِ الہلال کے مولانا آزاد کو سامنے لائیے جن کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے اب شکستِ پندار سے متعلق واقعہ کی طرف آئیے۔ جولائی ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے کہ مولانا (مرحوم) نے اپنی صدارت کے زعم میں "قائد اعظمؒ" کو بصیغۂ راز ایک تار بھیجا جس میں ایک متنازعہ معاملہ کے سلسلہ میں وضاحت چاہی تھی۔ قائد اعظمؒ مولانا کے صحیح مقام سے واقف تھے۔ انہوں نے اس کے جواب میں وہ تار ارسال فرمایا جس نے بین الاقوامی فضا میں مضراب کا کام کیا انہوں نے اس میں کہا تھا:

آپ کا تار ملا۔ میں اس رازداری کا قائل نہیں۔ چونکہ آپ ہندوستان کے مسلمانوں کا اعتماد کلیتہً کھو چکے ہیں۔ اس لئے میں بذریعہ خط و کتابت یا کسی اور طریق سے آپ سے ان معاملات پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ کیا آپ کو اس امر کا احساس نہیں کہ آپ کو ایک نمائشی صدر بنانے سے ہندوؤں کا اس کے سوا اور کچھ مقصد نہیں کہ اس سے یہ ظاہر ہو جائے کہ کانگریس یقیناً ایک قومی جماعت ہے اور اس طرح باہر کی دنیا کو دھوکا دیا جائے۔ آپ نہ ہندوؤں کے نمائندہ ہیں، نہ مسلمانوں کے کانگریس ہندو جماعت ہے۔ اس لئے اگر آپ کو عزتِ نفس کا کچھ پاس ہے تو اس جماعت سے فوراً مستعفی ہو جائیے۔ اس وقت تک آپ نے لیگ کی تخریب کے لئے انتہائی کوشش کر کے دیکھ لیا۔ اور آپ کو علم ہے کہ آپ کس طرح اپنی کوششوں میں ناکام رہے ہیں۔ اب ان حرکات کو چھوڑ دیجئے۔

(طلوعِ اسلام۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء صفحہ ۵۱)

مولانا (مرحوم) ہندوؤں کے جس ماحول میں زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے، اور جو کچھ انہیں کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کا ان کی نفسیات پر اثر انداز ہونا لازمی تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ان کے خیالات تضاد کا شکار ہو گئے تھے۔ وہ جس شد و مد سے تقسیم ہند

کی مخالفت کرتے چلے آرہے تھے، اسے ہم دیکھ چکے ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے جون ۱۹۴۷ء میں کیا کہا اسے مندرجہ ذیل خبر میں دیکھئے

> اعلانِ آزادی ۳ جون ۱۹۴۷ء کے بعد حضرت مولانا ابوالکلام آزاد شملہ میں قیام فرما تھے۔ ۲۴ جولائی کو شملہ کے پچیس (۲۵) تیس (۳۰) مسلمان شہریوں کا ایک وفد جس میں، میں بھی شامل تھا، حضرت مولانا سے ملاقی ہوا۔ مولانا نے گفتگو کا آغاز بعد علیک سلیک کے یوں کیا۔ "الحمد اللہ ملک، پاکستان اور ہندوستان دو مملکتوں کے طور پر آزاد ہو گیا۔ اب ہمارے سیاسی نظریات کے اختلافات بھی ختم ہو گئے۔ میرا جناح صاحب سے اختلاف سیاسی نظریات کا اختلاف تھا۔ اپنے اپنے نظریہ میں ہم پُرخلوص تھے۔ قوم نے ایک نظریہ قبول کر لیا اور ایک رد کر دیا۔ اس فیصلے کو میں صدق دل سے قبول کرتا ہوں۔ میری تمنا اور دلی دعا ہے کہ اسلام کے نام پہ حاصل کیا ہوا پاکستان مستحکم اور مضبوط ہو اور ترقی کرے۔ خدانخواستہ اب اگر پاکستان میں کسی قسم کی خرابی پیدا ہوئی تو بدنام اسلام ہو گا۔ بہرحال میری دعا ہے کہ پاکستان اسلامی مملکت بنے۔
>
> (طلوعِ اسلام۔ جون ۱۹۸۱ء ص ۴۲)

یہ کچھ مولانا مرحوم نے جون ۱۹۴۷ء میں کہا، اور اس کے چار ہی ماہ بعد (اکتوبر ۱۹۴۷ء میں) جامع مسجد (دہلی) میں تقریر کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا اسے ہم دیکھ چکے ہیں۔ اور پھر جنوری ۱۹۴۸ء میں جو کچھ ہندوستان کے مسلمانوں سے کہا، وہ بھی ہماری نظروں سے گذر چکا ہے۔ یہ تضاد، اس کرب و اضطراب کا غماز ہے جس سے ان کا قلبِ مضطرب طلسم پیچ و تاب بنا رہتا تھا۔ ان کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی

کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ سیاست ہے، اور سیاست میں نظریات میں تبدیلی شجرِ ممنوعہ نہیں۔ یہ درست ہے بشرطیکہ اس تبدیلی کو سیاست تک محدود رکھا جائے۔ لیکن یہ حضرات اپنے ہر نظریہ کو اسلام کے مطابق اور ہر مسلک کو دین کا تقاضا قرار دیتے تھے۔ مولانا آزاد کی پوزیشن اس باب میں اور بھی نازک تھی۔ وہ درحقیقت اسلام کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے اور اس کے جراثیم ان کے ذہن میں بہت پہلے سے پرورش پا رہے تھے۔

مولانا (مرحوم) کا سرمایۂ حیات ان کے تفسیری ترجمہ (ترجمان القرآن) کی دو جلدیں ہیں۔ جلد اول ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی تھی اور جلد دوم (جزو ۲۳ ویں سورۃ

تک ہے) سنہ ۱۹۳۶ء میں۔ اس کے بعد وہ قریب بیس سال تک زندہ رہے، لیکن تیسری جلد لکھ کر اس سلسلہ کو تکمیل تک نہیں پہنچا سکے۔

جلد اول میں سورہ فاتحہ کی تفسیر بڑی مبسوط ہے جس میں مولانا (مرحوم) نے اپنے اس مقصد کو واضح کر دیا ہے جس کے لئے یہ کاوش کی گئی تھی۔

اسلام کا دعویٰ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے آخری اور مکمل دین (ضابطۂ حیات) ہے۔ یہ منفرد ہے، اور کسی اہلِ مذہب کے ہاں یہ دین نہیں ہے۔ اس لئے نوعِ انسان کو خدا کی راہنمائی حاصل کرنے کے لئے اسلام کے آغوش میں آنا ہوگا۔ مولانا (مرحوم) نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ صحیح نہیں۔ انہوں نے لکھا ہے۔

(۱) قرآن نے نہ صرف یہ تبلایا ہے کہ ہر مذہب میں سچائی ہے، بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔

(۲) وہ کہتا ہے کہ دینِ حقیقی، ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی کا نام ہے جو انسان بھی ایمان اور نیک عملی کی زندگی اختیار کر لیگا، اس کے لئے نجات ہے، خواہ وہ تمہاری گروہ بندیوں میں داخل ہو یا نہ ہو۔

(۳) وہ کہتا ہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں، لیکن پیروانِ مذاہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرِ نو اختیار کریں، تو میرا کام پورا ہو گیا۔ انہوں نے مجھے قبول کر لیا۔

(۴) دین عالمگیر سچائیوں کا نام ہے جو تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں (دیکھئے ترجمان القرآن، جلد اول۔ تفسیر سورہ فاتحہ)

(مہاتما) گاندھی کہا کرتے تھے کہ متحدہ قومیت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام کو دیگر مذاہب پر افضلیت حاصل ہے اور مولانا آزاد نے اپنی تفسیر سے اس رکاوٹ کو دور کر دیا۔ چنانچہ کانگریس کی طرف سے اس تفسیر کا ہندی ترجمہ شائع اور لاکھوں کی تعداد میں تقسیم کیا گیا۔ ہندو لیڈر اپنی تقاریر میں اس کے حوالے اکثر دیا کرتے تھے۔

برہمو سماجی اسلام | مولانا آزاد (مرحوم) کا یہ "برہمو سماجی اسلام" دینِ خداوندی کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتا تھا، لیکن ان کے علمی تبحر کا دبدبہ اس قدر شدید تھا کہ کسی نے اس کی تردید کی جرأت نہ کی۔ مبداءِ فیض کی کرم گستری سے یہ جرأت بھی خدا کے اس بندے کے حصے میں آئی جسے بمدِ نیز کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ انہوں نے اس پر بھرپور تنقید کی جو ممتاز ماہنامہ "معارف" (اعظم گڑھ، یو۔پی) کی جنوری ۱۹۳۲ء کی اشاعت میں شائع ہوئی۔ اس نے

علمی اور مذہبی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔ (پرویز صاحب کا وہ مقالہ بعد میں طلوعِ اسلام بابت اگست ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا، اور اب ان کے مجموعہ مضامین - فردوسِ گم گشتہ میں شامل ہے)

مولانا مرحوم کی طرف سے اس کا کوئی جواب شائع نہ ہوا، حالانکہ ان کے معتقدین نے اس پر اصرار بھی کیا تھا۔

ہمارے دور میں اس حقیقت کی نقاب کشائی کا سہرا علامہ اقبالؒ کے سر ہے کہ (۱) اسلام ایک نجی مذہب نہیں، بلکہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا ضابطہ ہے جس کا قیام اپنی آزاد مملکت ہی میں ممکن ہے، اور (۲) اسلام میں قومیت کا معیار، ایمان کا اشتراک ہے نہ کہ وطنیت کا اشتراک۔ اس موضوع پر (مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ساتھ) ان کی بحث (معرکۂ دین و وطن) بین الاقوامی شہرت حاصل کر گئی تھی۔ سید نذیر نیازی (مرحوم) نے اپنی (زندہ جاوید تالیف "اقبال کے حضور" میں لکھا ہے کہ ایک نشست میں مولانا آزاد کا مذکورہ بالا نظریہ بھی حضرت علامہؒ کے زیرِ نظر آیا اور اس پر تفصیلی بحث ہوئی۔ انہوں نے جو کچھ فرمایا، اس کا ملخص یہ تھا کہ یہ نظریہ درحقیقت، دین کو سیاست سے الگ کر کے، لادینی سیاست (سیکولرازم) کی طرف لے جانے کا بڑا لطیف، لیکن پُرکار حربہ ہے۔ مولانا آزاد (اور دیگر نیشنلسٹ علماء) کا یہی مسلک تھا۔

جہاں تک اسلام میں معیارِ قومیت کا تعلق ہے، مولانا آزاد نے اِس باب میں وہ کچھ کہا جس سے مترشح ہوتا ہے کہ اسلام پر ان کا ایمان ہی نہیں رہا تھا۔ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اس حقیقت پر تھی کہ ہندوستان کے مختلف خطوں میں بسنے والے مسلمان دین کے اشتراک کی بناء پر جداگانہ قوم کے افراد ہیں۔ اس نظریہ کی مخالفت کرتے ہوئے، مولانا آزاد نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں (جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی) لکھا تھا:-

> یہ سب سے بڑا فریب ہے جو عوام کو دیا جاتا ہے کہ مذہب کا اشتراک ان خطوں کو، جو جغرافیائی، معاشی، لسانی اور ثقافتی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، متحد کر دے گا۔ یہ سچ ہے کہ اسلام نے ایک ایسی امت تشکیل کرنی چاہی تھی جو نسلی، لسانی، معاشی اور سیاسی حدود سے ماوراء ہو، لیکن تاریخ نے یہ ثابت کر دیا کہ کچھ عرصہ، زیادہ سے زیادہ ایک صدی کے بعد، اسلام اِس قابل نہیں رہا تھا کہ وہ محض اسلام کی بنیادوں پر مختلف مسلم ممالک کو واحد مملکت کی شکل میں باقی رکھ سکے

یہی پوزیشن اس وقت تھی، یہی آج ہے۔ (صفحہ ۲۲)

یعنی ایمان کے اشتراک کی بنیادوں پر عالمگیر امت کی تشکیل کا نظریہ، ارشاد خداوندی نہیں تھا۔ یہ انسانی قیاس تھا جسے تجربہ نے ناکام ثابت کر دیا۔ اب اس تجربہ کو جب اور جہاں بھی دُہرایا جائے گا، ناکام ثابت ہوگا۔

اسلام کی طرف سے مایوسی کا اس سے بڑھ کر اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن نہیں، اس سے بھی بڑھ کر ایک اور ثبوت ہے جسے ہم سینے پر پتھر رکھ کر درج کرتے ہیں۔ (۲۳) اپریل ۱۹۸۱ء کے نوائے وقت میں بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) منظور احمد صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا۔

کانگریس میں شمولیت کے بعد، لاہور کی ایک نشست میں، مولانا آزاد اور علامہ اقبالؒ کے درمیان اسلامیانِ ہند کے سیاسی مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی کہ دورانِ گفتگو مولانا آزاد نے ایک ایسا جملہ کہا کہ جو حضرت علامہؒ کی طبع پر بے حد گراں گذرا۔ ایک منانہ عالمِ دین سے یہ سن کر علامہ لرز گئے بقول سید نذیر نیازی (مرحوم) علامہ نے بعد میں ان سے فرمایا کہ میری طبیعت اتنی مشتعل ہوئی کہ جی چاہا کہ اس امام الہند کو وہ سناؤں کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔ اس نے یہ اذیت ناک الفاظ کہے تھے۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ کس اسلام کی بات کرتے ہیں؟ (ISLAM IS A SPENT FORCE) یہ ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔"

(طلوع اسلام۔ جون ۱۹۸۱ء، صفحہ ۹۳)

یہ تھی مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کی شبیہہ اسلام کے آئینے میں جہاں تک تحریکِ پاکستان کا تعلق ہے، اسے انہوں نے کس قدر نقصان پہنچایا تھا، اس کے متعلق نوابزادہ لیاقت علی خان (مرحوم) کی شہادت سے بڑھ کر اور کس کی شہادت ہو سکتی ہے۔ انہوں نے (سنہ ۱۹۴۶ء میں) کہا تھا:

گذشتہ نو سالوں میں، ہندوستان میں مسلمانوں کے مقصد کو، کسی فرد نے راشٹرپتی آزاد سے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا۔ انہوں نے، مسلمانوں میں تشتت و انتشار پیدا کرنے اور انکی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کیلئے ہر وہ حربہ استعمال کیا ہے جسے انسانی ذہن تلاش کر سکتا ہے۔

(عبدالوحید خان مرحوم کی کتاب۔ انڈیا وِنز فریڈم۔ دی اوور سائیڈ صفحہ ۲۱۱)

اور قائد اعظمؒ نے ان کی (مولانا مرحوم کی) بیچارگی پر ترس کھاتے ہوئے انہیں ان کے کانگریس کی صدارت کے زمانہ میں، بڑا ناصحانہ مشورہ دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا:۔

(مولانا) آزاد نے ہندوؤں کے نمک کو حلال کر دکھایا ہے۔ انہوں نے جس گرمجوشی کے ساتھ کانگریس کی خدمت اور اطاعت کی ہے، اگر اس سے آدھی گرمجوشی کے ساتھ خدا کی اطاعت کرتے تو آج معاشرہ میں انہیں بڑا باعزت مقام حاصل ہوتا۔ ہندوؤں کا یہ فریب کہ انڈین نیشنل کانگریس کا صدر ایک مسلمان عالم ہے، بیرونی ممالک تک بے نقاب ہو چکا ہے۔ مولانا آزاد کو چاہیئے کہ ان کی زندگی کے جو تھوڑے بہت دن باقی ہیں، انہیں ہندوؤں کا کرائے کا ٹٹو بننے کے بجائے اطمینانِ قلب سے گذاریں۔ ان کے لئے اب ایک ہی راستہ باقی ہے، اور وہ یہ کہ وہ سیاست سے ریٹائر ہو جائیں۔

(ایضاً۔ صـ۲۱۱)

لیکن افسوس کہ یہ اطمینان انہیں نصیب نہ ہوا!

یہ ہیں مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) جن کے متعلق اب یہاں (گویا) ایک تحریک سی چلائی جا رہی ہے کہ انہیں اسلام کا بہت بڑا ستون اور ملت کا عظیم محسن قرار دیا جائے۔ ریاض (خیر آبادی) نے غزل کے مخصوص انداز میں کہا تھا ؎

مرنے لوٹو کلیم! اب بن پڑی ہے بڑی اونچی جگہ قسمت لڑی ہے

پاکستان میں ان لوگوں کی بن پڑی ہے جنہوں نے تحریکِ پاکستان کی جی بھر کر مخالفت کی تھی۔ وہ اب جس قسم کی جی چاہے تحریکیں چلائیں۔ انہیں کون روک سکتا ہے! ہمیں تو رونا اپنی بدقسمتی پر آتا ہے جس سے ہمیں یہ دن دیکھنے پڑے۔ کہا جاتا ہے کہ (مولانا) مرحوم بہت بڑے عالم تھے۔ ہوا کریں، اسلام کے، ان سے کہیں بڑے عالم یہودیوں اور عیسائیوں میں بھی مل جائیں گے۔ جو شخص قرآن کے قرار دادہ معیارِ قومیت کو ایک ناکام تجربہ کہے اور اسلام کو چلا ہوا کارتوس، اس کی علمیت کے قصیدے پڑھے جائیں یا اس کا ماتم کیا جائے۔ اور جس شخص نے مطالبۂ پاکستان کی اس قدر شدید مخالفت کی ہو، اسے پاکستان کا دشمن قرار دیا جائے یا اس کے مجسمے نصب کئے جائیں؟

اے کاش! تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ مرتب ہوتی تو ایسے لوگوں کا صحیح مقام سامنے آتا!!

(مولانا مرحوم) کے معتقدین اکثر کہا کرتے ہیں کہ مولانا نے جو کہا تھا کہ اسلام نے اشتراکِ دین کی بنا پر جو امتِ واحدہ متشکل کی تھی، قریب ایک صدی کے بعد وہ باقی نہ رہی، تو یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

اس لئے مولانا کے خلاف یہ اعتراض کیسے وارد کیا جاسکتا ہے؟ آپ مولانا کے الفاظ کو ایک بار پھر سامنے لائیے۔ انہوں نے کہا تھا:

یہ سچ ہے کہ اسلام نے ایک ایسی امت کی تشکیل کرنی چاہی تھی جو نسلی، معاشی، سیاسی وغیرہ حدود سے ماوراء ہو لیکن تاریخ نے یہ ثابت کر دیا کہ کچھ عرصہ، زیادہ سے زیادہ ایک صدی کے بعد، اسلام اس قابل نہیں رہا تھا کہ محض اسلام کی بنیادوں پر مختلف مسلم ممالک کو واحد مملکت کی شکل میں باقی رکھ سکے۔ یہی پوزیشن اس وقت تھی۔ یہی آج ہے۔ لہٰذا یہ بہت بڑا فریب ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ اسلام کی بنیاد پر امتِ واحدہ متشکل کی جاسکتی ہے۔

تاریخی حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے اسلامی اصولوں کو چھوڑ دیا تو پھر امت کی وحدت باقی نہ رہی۔ لیکن مولانا (مرحوم) فرماتے ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد اسلام اس قابل نہیں رہا تھا کہ وہ امت میں وحدت پیدا کر سکے۔ یہ ہے وہ اعتراض جو مولانا کے خلاف عائد کیا جاتا ہے۔ اگر مولانا کے اس استدلال کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر (ایک یہی اصول نہیں) اسلام کا کوئی اصول بھی سچا ثابت نہیں ہوگا۔ تاریخ ان سب کی تغلیط کر دے گی۔ قرآن نے کہا تھا کہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ... (۲/۱۴۳) شروع شروع میں یہ امت واقعی شہداء علی الناس رہی لیکن (تاریخ بتاتی ہے کہ) کچھ عرصہ کے بعد یہ ایسی نہیں رہی تھی۔ قرآن نے کہا تھا کہ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (۴/۱۴۱)۔ "خدا کبھی ایسا نہیں کرے گا کہ کفار مومنوں پر غالب آجائیں"۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کچھ عرصہ تک تو ایسا رہا تھا لیکن پھر اس کے الٹ ہوگیا تھا۔ قرآن نے کہا تھا کہ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۹/۳۳) یعنی اسلامی نظام تمام نظامہائے عالم پر غالب آئے گا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ صدرِ اول میں تو یہ صورت رہی لیکن کچھ عرصہ کے بعد دوسرے نظام اسلامی نظام پر غالب آگئے۔ یہ اور اسی قسم کے دیگر متعدد شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ (مولانا آزاد کے استدلال کی رُو سے) کچھ عرصہ کے بعد اسلام اس قابل ہی نہیں رہا تھا کہ اپنے دعاوی کو سچا ثابت کر سکے۔ اس بنا پر (مولانا) اس نتیجہ پر پہنچنے میں حق بجانب تھے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔

مولانا (مرحوم) کو کون بتاتا کہ جس قرآن نے یہ دعاوی کئے تھے اس نے ساتھ

ہی یہ بھی کہہ دیا تھا کہ یہ اسی قوم کے حق میں صحیح ثابت ہوں گے جو قرآنی اصولوں پر عمل پیرا رہے گی۔ جس وقت وہ ان سے روگردانی کریگی، ان ثمرات سے محروم ہو جائے گی۔ اس نے جب کہا تھا کہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ۔ تم سب سے بالاتر رہو گے۔ تو اس کے ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی تھی کہ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۹) بشرطیکہ تم مومن رہے۔ اس امت کو ہر قسم کی سعادات و برکات، قرآن کے اتباع سے حاصل ہوئیں لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں وارن کر دیا گیا تھا کہ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ .... (۴۷/۳۸)۔ اگر تم نے اس سے روگردانی کی تو یہ تمام نعمتیں تم سے چھن جائیں گی اور تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لیگی۔ لہٰذا تاریخ نے قرآن کے تمام دعاوی کا ثبوت بہم پہنچایا کہ جب تک یہ قوم (امت مسلمہ) ان اصولوں پہ کاربند رہی، ان کے ثمرات سے بہرہ یاب ہوتی رہی۔ جب ان سے رُوگردانی کی، تو ان سے محروم ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی کہہ دیا کہ یہ اصول ابدی ہیں۔ جب اور جہاں بھی کوئی قوم انہیں اپنائے گی ان کے ثمرات سے بہرہ ور ہو جائے گی۔ اس طرح اس نے بتایا کہ اسلام کبھی بھی "چلا ہوا کارتوس" ثابت نہیں ہوگا۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ "مولانا کو کون بتاتا ہے کہ ..." لیکن مولانا (مرحوم) کو یہ کچھ بتانے کی ضرورت کیا تھی؟ وہ اپنے دورِ الہلال میں ساری امت کو بتایا کرتے تھے کہ تم نے اسلام کو چھوڑ کر کیا کچھ گنوایا ہے، اور پھر سے اسلام کو اپنانے سے تم اس متاعِ گم گشتہ کو کس طرح پا لو گے! ان کے اس دور کے چند ایک شذرات ملاحظہ فرمائیے انہوں نے الہلال بابت (۳۰) جولائی ۱۹۱۳ء میں لکھا تھا:

"اسلام ایک آخری دینِ الٰہی تھا جس نے نہ صرف احکام شریعت ہی میں بلکہ حیاتِ قومی کی ہر شاخ میں ہم کو سب سے آخر اور سب سے بہتر اصول دے دیئے۔ اور دنیا خواہ کتنی ہی بدل جائے لیکن آزما لیا جا سکتا ہے۔ کہ ان اصولوں کی صداقت کو بدلنے کی ضرورت نہیں .... تکمیل دین کے لئے ضروری تھا کہ ہمیشہ کے لئے اس کے پیرو اپنی تمام اصولی ضروریات میں مستغنی اور بے پرواہ ہو جائیں اور ان کو کسی نئی تلاش اور نئے اصولوں کی جستجو نہ رہے .... میرا عقیدہ ہے کہ آج حیاتِ ملی اور حصولِ عظمت ملی کے لئے مسلمانوں کو اپنے اعمال کی کسی شاخ میں بھی "تاسیس" کی ضرورت نہیں۔ تجدید کی ضرورت ہے کہ جن اصولوں کو ہم نے بھلا دیا ہے ان کو دوبارہ زندہ کریں۔ اور جس متاع کو حاصل کر کے گم کر دیا ہے اس کے سراغ میں پھر نکلیں .... ہم کو اپنی گم کردہ کانوں کے سراغ میں نکلنا چاہیئے جن کی دولت لازوال تھی اور ہمیشہ لازوال تھی۔"

(بحوالہ طلوعِ اسلام۔ بابت جون ۱۹۳۸ء)

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"مسلمانوں کے لئے راہِ عمل ہمیشہ سے ایک ہی رہی اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ایک ہی ہے یعنی ہندوستانی مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اس معصیت سے باز آجائیں جس میں وہ ایک عرصہ سے مبتلا ہیں اور جس کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے ان پر بند ہو گئے ہیں۔۔۔۔ وہ بالکل اس گلے کی طرح ہیں جس کا ریوڑ جنگل کی جھاڑیوں میں منتشر ہو کر گم ہو گیا ہو۔ (مسئلہ خلافت وجزیرۃ العرب)۔

الہلال میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

ہماری پولیٹیکل گمراہیاں صرف اس لئے ہیں کہ ہم نے قرآن کے دستِ راہ نما کو اب تک اپنا ہاتھ سپرد نہیں کیا۔ ورنہ تاریکی کی جگہ آج ہمارے چاروں طرف روشنی ہوتی۔ (بحوالہ طلوعِ اسلام۔ نومبر ۱۹۳۸ء)

انہوں نے الہلال بابت ۲۹ ستمبر ۱۹۱۲ء میں لکھا تھا:

"ہم مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے سامنے ہمیشہ دو راستے ہی دیکھے، یا گورنمنٹ پر اعتماد اور یا ہندوؤں اور کانگریس کی شرکت۔ یعنی ہمیشہ آزادی کو ہندوؤں کا مرادف سمجھا مگر خود اپنے تئیں بھولے رہے کہ خدا کو بھلا دیا۔ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ (۵۹/۱۹)۔ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خود اپنے ہی کو بھول گئے۔ اس لئے ہماری تمام سعی و جہد کا ماحصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو یاد دلا دیں کہ دنیا میں رہنے کے لئے جتنی چیزیں مطلوب ہیں۔ وہ خود ان کے پاس موجود ہیں۔ اوروں کے دروازوں کو دریوزہ گری کے لئے کیوں تک رہے ہیں۔"

یہ ہے جو مولانا آزاد (مرحوم) اپنی زندگی کے اسلامی دور میں کہا کرتے تھے، اور وہ، ہے جو وہ گاندھی آشرم میں آنے کے بعد کہنے لگے۔ یعنی یہ کہنے لگے کہ مطالبہ پاکستان کے حامی، اسلام کے نام پر جو کچھ کہتے ہیں وہ سب فریب ہے۔ اسلام میں اب یہ صلاحیت ہی نہیں کہ وہ اس قوم کو دوبارہ زندگی عطا کر سکے۔ ان کا یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ اسلام کی رُو سے قومیت کا معیار۔ ایمان کا اشتراک ہے۔ مولانا مرحوم کی یہی تبلیغ تھی جس کا اثر یہ تھا کہ جب مشرقی پاکستان الگ ہوا ہے تو مسز اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ ہماری یہ فتح ہماری فوجوں کی کامیابی نہیں۔ یہ درحقیقت شکست ہے اس باطل نظریہ کی جس کی رو سے کہا جاتا تھا کہ قومیت کا معیار مذہب ہے۔

یہ حضرات پاکستان ہی کو نہیں خود اسلام کو بھی جس قدر نقصان پہنچا گئے ہیں اس کی مثال کم ملے گی۔

حقائق و عبر

۱۔ تیری بربادیوں کے تذکرے ہیں آسمانوں میں

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ایلوپیتھک ڈاکٹر ہیں ایک عرصہ تک ڈاکٹری کی پریکٹس کرتے رہے۔ خاصا وقت جماعتِ اسلامی سے متمسک رہے۔ اسلامی جمعیت طلبا میں انہیں نمایاں پوزیشن حاصل تھی۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں جب (کالعدم) جماعت اسلامی کے بعض اراکین نے مودودی صاحب (مرحوم) سے علیحدگی اختیار کی ان میں ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ خاصہ عرصہ تک خاموش رہنے کے بعد انہوں نے خدام القرآن کے نام سے ایک انجمن کی بنا ڈالی جس کا مقصد قرآنی تعلیم کی نشر و اشاعت تھا۔ اس کے بعد انہوں نے، جماعت اسلامی کے نقش قدم پر، تنظیم اسلامی کے نام سے اپنی الگ پارٹی قائم کی۔ وہ خود اس پارٹی کے امیر ہیں اور اس میں شامل ہونے والوں سے باقاعدہ بیعت لیتے ہیں۔ وہ آہنی ڈسپلن والی جماعت جو اپنے امیر کے اشارے پر کٹ مرنے کو تیار ہو۔ (میثاق بابت جولائی ۱۹۸۴ء صفحہ ۳۶)۔ اس تنظیم کے مقاصد اور عزائم کیا ہیں؟ اسے انہوں نے پردۂ اخفا میں نہیں رکھا۔ (مثلاً) سابقہ اپریل وہ بھارت کے دورے پر گئے تو حیدرآباد دکن میں ایک نشست منعقد ہوئی۔ اس کی روئداد (ان کے صاحبزادہ کے قلم سے) ان کے ماہنامہ میثاق کی جون ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں ان الفاظ میں شائع ہوئی۔

کئی حضرات کی جانب سے سوالات ہوئے جن میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ پاکستان میں اسلام کے نفاذ کے سلسلے میں آپ کا طریقۂ کار کیا ہوگا؟ جواباً ابا جان نے فرمایا کہ ایک مسلمان حکومت کے ہوتے ہوئے، جو اگرچہ صرف نام کے اعتبار سے مسلمان ہے، اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے ایک ایسی تنظیم کا قیام ضروری ہے جس کے رفقاء ایک امیر کے ہاتھ پر سمع و طاعت اور جہاد فی سبیل اللہ کی بیعت کریں۔ ان کی بھرپور تربیت کی جائے اور جب ایک ایسی جمعیت فراہم ہو جائے، کہ امیر کو ان کے بارے میں اعتماد ہو کہ وہ جان ہتھیلیوں پر رکھ کر آتے ہیں اور امیر کے اشارے پر کٹ مرنے کو تیار ہیں تو وہ اس نظام کے کسی منکر کے خلاف ایک سیسہ پلائی ہوئی

حاشیہ: ۔۔۔ کے اکثر دوروں پر رہتے تھے جن میں سرِفہرست امریکہ ہے۔

دیوار بن کر کھڑے ہو جائیں گے۔ مثلاً جماعت کا امیر اگر فیصلہ کرے کہ ۱۴ اگست کو خواتین کی کھلے بندوں جو پریڈ ہوتی ہے اس کو نہیں ہونے دیں گے۔ تو اب اس منکر کے خلاف ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوگی۔ اگر حکومت وقت اس پر رضامند ہو جائے کہ پریڈ نہیں ہوگی تو کسی اور منکر کے خلاف یہی طرزِ عمل اختیار کیا جائے گا اور منکرات کو ختم کرنے کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اس طرح بجائے اس کے کہ خود اقتدار کے طالب بن کر سامنے آئیں، اس حکومت کے ہاتھوں منکر کی "نکیر کرائی جائے اور معروف کو رائج کرایا جائے گا۔ لیکن اگر حکومت وقت اس پر تیار نہ ہو تو ظاہر ہے اس منکر کے خلاف جانوں کو ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اترنا ہوگا۔ گولیاں کھانی ہوں گی۔ ماریں سہنی ہوں گی۔ جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی ہوں گی۔ لیکن یہ سب منحصر ہے اس بات پر کہ امیر کو یقین اور اعتماد ہو اپنے ساتھیوں کی تعداد پر بھی اور ان کی جانفروشی پر بھی ..... !! یہ ہے وہ طریق کار جس کے ذریعے کسی نام نہاد اسلامی حکومت میں حقیقی اسلامی انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ (ص۷۷)

اسی ماہنامہ کی جولائی ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں ان کے نائب ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے، جس میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی تنظیم کے ارتقائی مراحل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے :-

"تیسری منزل پر چڑھتے کے لیے۔ یعنی اللہ کے دین کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے یہ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی شکل (یعنی اللہ کے راستے میں جنگ) اختیار کرے گا۔ لہٰذا باطل قوتوں، اور اللہ کے دین کے قیام میں رکاوٹ بننے والے افراد سے نپٹنے کے لیے سیف بدست میدان میں آنا پڑے گا ...... آگ اور خون کی وادی سے گزر کر ہی یہ فریضہ ادا ہو پائیگا۔　　(میثاق بابت جولائی ۱۹۸۴ء ص۵۵)

آپ تصور میں لائیے اس فساد کو جس کی آماجگاہ یہ بدنصیب ملک اس وقت بنے گا جب ڈاکٹر صاحب کی اسکیم عمل میں آئیگی۔ ڈاکٹر صاحب (بہ حیثیت امیر) جس عمل کو منکر قرار دیں گے اسے زبردستی روکنے کے لئے ان کی جماعت میدان میں آ جائیگی۔ اگر حکومت نے گھٹنے ٹیک دیئے تو ھو المراد، ورنہ معاملہ عملی تصادم تک پہنچ جائے گا۔ اوّل تو ڈاکٹر صاحب کے "منکرات" کی فہرست محدود نہیں (وہ تو عیدالفطر کی سویوں اور کرکٹ کے کھیل تک کے بھی خلاف ہیں)۔ ایک منکر کے ازالہ کے بعد دوسرا منکر سامنے آ جائے گا اور اس طرح یہاں جنگ و فساد کا لامتناہی سلسلہ جاری رہے گا۔ پھر، منکرات کے انسداد کے لئے، نہ تو ڈاکٹر صاحب کو کوئی لائسنس حاصل ہے، نہ ہی اس پر ان کی اجارہ داری ہے۔ جس کا جی چاہے اسی قسم کی جماعت تیار کر کے، حکومت کے، یا خود

ڈاکٹر صاحب کے بالمقابل (یہ کہتا ہوا) کھڑا ہو جائے کہ جسے ڈاکٹر صاحب منکر قرار دے رہے ہیں وہ ہمارے عقیدے کے مطابق، منکر نہیں، معروف ہے۔

پاکستان کے دشمن چاہتے ہی یہ ہیں کہ یہاں، مذہب کے نام پر، اس قسم کی صورت مسلسل "قائم رہے"۔

۲۔ فقہ حنفیہ کتاب و سنت نہیں

مودودی صاحب (مرحوم) نے تجویز کیا کہ چونکہ کتاب و سنت کی بناء پر کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کرلیں، اس لئے یہاں فقہ حنفی رائج کر دی جائے۔ (گویا فقہ حنفی کو تمام فرقے اسلامی تسلیم کرلیں گے!) چنانچہ اس کے بعد اسلام کے نام سے جو قوانین یہاں نافذ ہوئے ہیں ان کی بنیاد فقہ حنفی پر ہی ہے۔ شیعہ حضرات تو یہ کہہ کر دیگر تمام فرقوں سے الگ ہو گئے کہ ان کی اپنی فقہ ہے اور انہوں نے صدر مملکت سے اس امر کی ضمانت لے لی کہ کسی فرقہ کی فقہ ان پر مسلط نہیں کی جائیگی۔ سنی (اہل فقہ) اور اہلحدیث دونوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے قوانین کتاب و سنت پر مبنی ہیں۔ ہفت روزہ اہلحدیث فرقہ اہلحدیث کا ترجمان ہے۔ اسکی (۲۰) جولائی ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں ایک تفصیلی مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے۔

پھر وہی فقہ حنفیہ

پاکستان میں کتاب و سنت کے نام سے فقہ حنفیہ کے نفاذ کی بھرپور مزاحمت کی جائے گی۔ اس کے بعد فقہ حنفیہ کی بھرپور مخالفت کی گئی ہے اور آخر میں کہا گیا ہے۔

> حکومت ایک بار پھر نوٹ کرلے کہ فقہ حنفیہ ہے، اسلام نہیں ہے۔ اور اس نے یہاں اسلام نافذ کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ پس اس نے اگر کسی درجہ سے بھی یہاں فقہ حنفی کو نافذ کرنے کا قصد کیا تو پاکستان کے ایک کروڑ اہل حدیث اس کے ضرور مزاحم ہوں گے اور وہ پھر فقہ حنفی کا دیوان اہل حدیث کے ایک کروڑ لاشوں کے انبار پر ہی استوار کر سکے گی۔

اس کے ساتھ اس کا بھی اعتراف ہے کہ پاکستان کے اہل حدیث اپنی بدنصیبی سے دو دھڑوں میں بٹ چکے ہیں۔

ایک اخباری خبر کی تصحیح

روزنامہ جنگ (لاہور) کی (۲۹) جولائی ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

پنجاب کے گورنر لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی خان کو آج آئمہ کی صوبائی نمائش

کے موقعہ پہ آم کی ایک ایسی قسم بھی اٹھائی گئی جو ستمبر۔ اکتوبر کے مہینوں میں پک کر تیار ہو گی۔ اس طرح اب لوگ موسم سرما میں بھی آم کھا سکیں گے۔

خبر کا آخری حصہ تصحیح طلب ہے۔ اسے یوں ہونا چاہیئے کہ

اس طرح اب بیرونی ممالک کے لوگ موسم سرما میں بھی آم کھا سکیں گے [۱]

یہاں کے عوام تو موسم میں بھی آموں کو دیکھنے کو ترس جاتے ہیں۔ جنتی معاشرہ میں پھلوں کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ۔ (۶۹/۲۳) وہ کثیر بھی ہوں گے اور ہر ایک کی دسترس میں بھی۔ لَا مَقْطُوْعَةٍ وَّ لَا مَمْنُوْعَةٍ (۵۶/۳۳) نہ ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی کی جائیگی۔ نہ ہی وہ کسی کے لئے ممنوع ہوں گے۔ اس کے برعکس نظامِ سرمایہ داری میں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ کوئی محتاج اور مسکین ان کے قریب نہ آنے پائے (۸۹/۱۸؛ ۶۹/۳۴)

۴۔ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ؟

قرآن مجید کے آخری پاروں میں ایسے انقلاب کی علامات سامنے لائی گئی ہیں جن کے ظہور پذیر ہونے کے بعد دین اللہ (نظام خداوندی) پھر سے متمکن ہوگا۔ ان میں ایک علامت یہ بھی ہے کہ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (۸۱/۹-۸) جاہلیت عرب میں عورت کو اس قدر باعث ذلت سمجھا جاتا تھا کہ جب کسی کو بیٹی کی پیدائش کی خبر ملتی تو وہ لوگوں سے منہ چھپائے چھپائے پھرتا تھا اور اسے گڑھا کھود کر زندہ دفن کر دیا کرتا تھا۔ اس لڑکی کو مَوْءٗدَة کہا جاتا تھا۔ ان آیات میں کہا گیا ہے کہ ایسا دور آئیگا جب مَوْءٗدَة کی فریاد رسی ہوگی اور اس سے پوچھا جائے گا کہ تمہیں آخر کس جرم کی پاداش میں زندہ درگور کر دیا گیا تھا؟ اصطلاح میں تو مَوْءٗدَة اسی لڑکی کو کہا جاتا تھا جسے زندہ دفن کر دیا جاتا تھا لیکن صدرِ اول کے بعد مسلمانوں نے جو کچھ عورتوں کے ساتھ کیا ہے اس اعتبار سے یہ تمام عورتیں مَوْءٗدَة ہیں قرآن نے کہا ہے کہ ان زندہ درگور عورتوں کا صدیوں تک کوئی پرسانِ حال نہیں ہوگا۔ لیکن بالآخر ایک زمانہ آئے گا جس میں یہ سوال اٹھے گا کہ مردنے کس جرم کی پاداش میں ان مظلوموں کا یہ حال بنا رکھا ہے؟ قرآن کا انداز بیان بڑا حقیقت رس ہے۔ عدالت میں بالعموم مجرم سے پوچھا جاتا ہے کہ تم نے اس جرم کا ارتکاب کیوں کیا ہے؟ لیکن قرآن کہتا ہے کہ اس "مقدمہ" میں مظلوم سے پوچھا جائے گا کہ مجرم نے تمہارے ساتھ یہ ظلم تمہارے

---

[۱] اسی اخبار میں یہ بتایا گیا ہے کہ پاکستان نے اس سال بیس کروڑ روپے کے آم برآمد کئے۔

کس جرم کی پاداش میں کیا ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ اب وہ دور آگیا ہے جس کی (قرآن نے) یہ علامت بتائی ہے۔ خود ہمارے ہاں، عورتوں کے کمیشن بٹھائے جا رہے ہیں یہ تحقیق کرنے کے لئے کہ مردوں نے ان کے حقوق کو کسطرح پامال کیا ہے اور ان کی بازیابی کی کیا صورت ہوسکتی ہے! اگرچہ ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع شدہ "اسلامی" قوانین کے محافظ انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ موؤدۃ قبر سے اٹھنے نہ پائے لیکن جب قرآن نے پوری تحدی کے ساتھ کہا ہے کہ ایسا دور آئے گا جب ان زندہ درگور صنف کی داد رسی ہوگی اور انہیں دوبارہ زندگی عطا کی جائے گی تو انسانوں کے وضع کردہ قوانین اس کے راستے میں روک بن کر کھڑے نہیں ہوسکیں گے۔ جس انداز سے عورتوں نے اپنے حقوق کا مطالبہ شروع کر دیا ہے، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ قبروں سے اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔ صدیوں کی محرومیٔ گویائی کی وجہ سے اگرچہ یہ ہنوز تتلاتی ہوئی زبان میں بات کرتی ہیں، لیکن رفتہ رفتہ ان کی زبانوں پہ پڑی ہوئی گرہیں کھلتی جائیں گی۔ قرآن نے جو کہا تھا کہ عَلَّمَہُ الْبَیَانَ (۵۵/۴)۔ "خدا نے انسان کو قوتِ گویائی عطا کی ہے"۔ تو اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ واضح رہے کہ قرآن نے جو کچھ انسان کے متعلق کہا ہے وہ مردوں اور عورتوں دونوں کے متعلق ہے۔ لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ یہ قوتیں اور صلاحیتیں قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے صرف کی جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ مردوں نے عورتوں کی صلاحیتوں کو پامال کر کے انہیں مفلوج کر دیا تھا، تو یہ اس کے ردِّ عمل میں حدود خداوندی سے بیباک ہو کر سرسام میں مبتلا ہو جائیں۔ موؤدۃ قبر سے اٹھے لیکن پیکرِ انسانیت کیساتھ شعلۂ جوالہ بن کر نہیں۔ یہی اسلام کا پیغام ہے۔

۵۔ علامہ اقبالؒ اور دو قومی نظریہ

سوال:۔ دو قومی نظریہ کے سلسلہ میں آپ علامہ اقبالؒ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں گویا انہی نے پہلے پہل یہ تصور پیش کیا تھا۔ لیکن آج کل تحریکِ پاکستان کے ضمن میں جو کچھ کہا اور لکھا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ تصور علامہ اقبالؒ سے پہلے بھی موجود تھا۔ کیا آپ بتائیں گے کہ اس باب میں علامہ اقبالؒ کو کسطرح سبقت حاصل ہے؟

جواب:۔ یہ ٹھیک ہے کہ دو قومی نظریہ کا تصور علامہ اقبالؒ سے پہلے بھی موجود تھا لیکن اس کی بنیاد سیاست کی مصلحتیں اور مسلمانانِ ہند کی مقامی پوزیشن تھی۔ علامہ اقبالؒ نے یہ نظریہ پیش کیا کہ وطن کے اشتراک کی بناء پر قومیت کا نظریہ خلافِ اسلام ہے قرآن کی رُو سے معیارِ قومیت ایمان کا اشتراک ہے۔ یہ ایک ابدی حقیقت ہے۔ اس کا مدار

نہ کسی مقام کے سیاسی مصالح پر ہے نہ اعداد و شمار پر۔ ایمان کے اشتراک کی بنا پر متشکل ہونے والی اُمتِ مسلمہ زمان و مکان کی حدود سے ناشناس اور وطنیت کی بیگانگت سے نامانوس ہے۔ یہ تھی اقبالؒ کی وجۂ مسابقت۔ اقبالؒ سے پہلے تو قوم کے سامنے یہ تصور نہیں تھا اس لئے وہ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے حق میں سیاسی دلائل ہی دیا کرتی تھی۔ افسوس تو موجودہ قوم اور اس کے نام نہاد رہنماؤں پر ہے کہ وہ بھی دو قومی نظریہ کی بنیاد ہندوستان میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور ہندوؤں کی تنگ نظری قرار دیتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ پاکستان کی جداگانہ مملکت کا قیام جن قرآنی بنیادوں پر عمل میں آیا تھا۔ کوشش کی جاتی ہے کہ ان کا کہیں ذکر تک نہ آنے پائے۔ اس لئے کہ ان سے نہ مستبد اربابِ اقتدار کا اقتدار باقی رہتا ہے۔ نہ سیاسی رہنماؤں کی قیادت۔ نہ مذہبی پیشواؤں کی پیشوائیت باقی رہتی ہے، نہ سرمایہ داروں کی قارونیت۔ ان سے صرف خدا کا اقتدار باقی رہتا ہے اور تکریمِ انسانیت۔ یہی اقبالؒ کا پیغام تھا۔

بھانت بھانت کی بولیاں

سوال:۔ اسلام کی آجکل یہ حالت ہو رہی ہے کہ جتنی زبانیں ہیں، اتنے ہی مختلف اس کے مفہوم ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا اس کا ایک متفق علیہ مفہوم متعین نہیں ہو سکتا؟

جواب:۔ اسے آپ ایک مثال کی رُو سے سمجھئے۔ آپ نے بعض خانقاہوں میں یا ویسے ہی کسی درخت کے نیچے دیکھا ہو گا کہ ننگ دھڑنگ قسم کے ایک "بزرگ" بیٹھے یا لیٹے ہیں۔ حرکتیں مجنونانہ۔ باتیں مبہم اور بے ربط۔ انہیں مجذوب کہا جاتا ہے جنہیں سلسلہ ولایت (تصوف) کے بلند ترین مقام پر فائز سمجھا جاتا ہے۔ صاحبِ غرض عقیدت مندوں کا حلقہ ان کے گرد بیٹھا رہتا ہے اس انتظار میں کہ ان کی زبان سے کوئی لفظ نکلے۔ جونہی انہوں نے کچھ کہا (مثلاً یہ کہ "تین۔ آٹھ سے کام ہو جائیگا") تو ہر ایک نے ان الفاظ کو پلے باندھ لیا اور اپنی اپنی منشا کے مطابق ان کا مفہوم متعین کرنے لگ گیا۔

ہمارا اسلام کے متعلق بھی (معاذ اللہ) کچھ ایسا ہی تصور ہے کہ یہ مبہم اور مجمل سی باتیں کرتا ہے جن کا مفہوم اور مطلب ہر شخص اپنی منشاء کے مطابق متعین کر لیتا ہے۔ ہمارے ہاں اس قدر فرقوں کا وجود اسلام کے متعلق اسی تصور کا نتیجہ ہے۔ جب تک قرآن خالص کو اتھارٹی تسلیم نہیں کیا جائیگا۔ اسلام کا متفق علیہ مفہوم متعین نہیں ہو سکیگا قانون کی وحدت اس کے مفہوم کی وحدت۔ قوم کی وحدت۔ اس کے مسلک و مشرب

کی وحدت۔ ان سب کا دارومدار اتھارٹی کی وحدت پر ہے۔ یہی مطلب لا الٰہ الا اللہ کا ہے یعنی خدا کے سوا کوئی اتھارٹی نہیں۔ جب تک کتاب اللہ کو اتھارٹی اور واحد، بلاشرکتِ غیرے اتھارٹی تسلیم نہیں کیا جاتا، نہ قوم میں نظری وحدت پیدا ہو سکتی ہے۔ نہ عملی ۔ نہ اسلام کا واحد مفہوم متعین ہو سکتا ہے نہ کوئی قانون اسلامی کہلا سکتا۔ خدا کے سوا کوئی اور اتھارٹی مقرر اور تسلیم کر لینا شرک ہے۔ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ (۱۲/۱۰۶) اکثر لوگ ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود، مشرک کے مشرک رہتے ہیں، انہی کے متعلق آیا ہے۔ یہ بتوں کو نہیں پوجتے پر خدا کے سوا اوروں کو اتھارٹی تسلیم کرتے ہیں۔

---

(۷) ایک جہادِ عظیم! فرقہ اہلحدیث کے ترجمان ہفت روزہ الاعتصام (لاہور) کی اشاعت بابت ۱۰ اگست میں، ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فقہ حنفی کے پیرو ایک صاحب نے ایک کتاب شائع کی جس میں دعویٰ کیا گیا کہ رفع الیدین (نماز میں دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھانا) خلاف سنت ہے۔ انہوں نے اسے سنت ثابت کرنے والے کے لئے ایک ہزار روپیہ کے انعام کی پیشکش کی اس پر

> ایک مردِ حق میدان میں آیا جس نے تن تنہا اس چیلنج کو قبول کیا اور اثباتِ رفع الیدین میں (۲۲۸) احادیث لیکر عدالت میں حاضر ہو گیا (عدالت نے اس کی درخواست کو مسترد کر دیا تو) اس مردِ میدان نے ہمت نہ ہاری اور اپنا ذاتی مکان پچاس ہزار روپے میں فروخت کر کے باقاعدہ جہاد کا آغاز کر دیا اور مقدمہ جیت لیا۔

انہوں نے اپنے دلائل کو مرتب کر کے ایک کتاب کی شکل میں شائع کر دیا۔ جس کی ضخامت (۲۹۴) صفحات ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں جن علماء نے تعاون کیا ہے مرتب نے انہیں مجاہدین قرار دیا ہے۔ اور الاعتصام نے لکھا ہے کہ

> مرتب کتاب نے جس دیدہ ریزی، ہمت و ثبات اور مالی ایثار کا ثبوت دیا ہے۔ وہ لائق تبریک و تحسین ہے۔

ان حضرات نے (۲۲۸) احادیث کی تائید سے ثابت کر دیا کہ صحیح نماز وہ ہے جس میں ہاتھ کانوں تک اٹھائے جائیں۔ لیکن صلوٰۃ کے صحیح اور غیر صحیح ہونے کا ایک معیار اللہ تعالیٰ نے بھی بتایا ہے۔ اور وہ یہ کہ

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ (۲۹/۴۵) یہ حقیقت ہے کہ

صلوٰۃ بے حیائیوں اور برائیوں کو روک رہتی ہے۔

ہم معاصر الاعتصام سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا انہوں نے اس امر کا اطمینان کر لیا ہے کہ جس نماز میں رفع یدین نہ کیا جائے اس سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا اور جس نماز میں رفع یدین کیا جائے اس سے یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے؟ نماز تو وہی صحیح ہو گی جس سے منشاءِ خداوندی پورا ہو!

---

(۸) اجتماعی توبہ

سوال:۔ توبہ کے معنی اپنے کسی گناہ سے باز آجانے کے ہیں۔ لیکن قرآن مجید میں ایک جگہ ہے، وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ (۲۴/۳۱) "اے مومنو! تم سب کے سب خدا کی طرف توبہ کرو۔" اس سے کیا مراد ہے؟ کیا کسی ایک شخص کی لغزش سے تمام کی تمام جماعت کو توبہ کرنی پڑیگی؟

جواب:۔ پہلے توبہ کا مفہوم سمجھ لیجئے۔ ایک راہرو کسی دوراہے پر سے غلط راستے کی طرف مڑ گیا۔ تھوڑی دور جاکر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اسے صحیح راستے کی طرف آنے کے لئے، اس مقام پر واپس جانا ہوگا جہاں سے وہ غلط راستے کی طرف مڑ گیا تھا۔ اس واپسی کا نام توبہ ہے۔

اگر ایک فرد سے یہ غلطی ہوئی تھی تو اس فرد کو واپس جانا ہوگا۔ لیکن اگر کسی قافلہ نے غلط راستہ اختیار کر لیا تھا تو ظاہر ہے کہ اس پورے کے پورے قافلے کو واپس آنا ہوگا۔ اسے اجتماعی توبہ کہا جائے گا۔

ہماری یہی حالت ہے۔ صدرِ اوّل کے بعد، ہمارا قافلہ، غلط راستے کی طرف مڑ گیا اور اس کے بعد دیکھا ہی نہیں کہ وہ راستہ کونسا ہے جس پر ہم چلے جا رہے ہیں۔ صدیوں سے ہمارا پورے کا پورا معاشرہ، پوری کی پوری امت، غلط راستے پر چلی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ قوم اس غلط راستے پر جس قدر آگے بڑھتی جائے گی اسی قدر اپنی (صحیح) منزل مقصود سے دور ہٹتی جائیگی۔ اس حالت میں جسے اسلامی احکام پر عمل یا اسلامی نظام کا احیاء کہا جاتا ہے، وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ اس قافلہ کی رفتار کو تیز کر دیا جائے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اس سے امت کا یہ کارواں، صحیح راستے (صراطِ مستقیم) سے اور تیزی سے دور ہوتا جائے گا۔ قرآن کریم کے الفاظ میں فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ (۵۷/۱۶) وہ مدت مدید تک غلط راستے پر چلتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل سخت ہو گئے۔ ان میں غلط اور صحیح کا احساس ہی مٹ گیا

وہ اس فریبِ نفس میں مبتلا ہو گئے کہ وہ جس راستے پہ چلے جا رہے ہیں وہی صحیح راستہ ہے۔ اور اس کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (۴۳/۲۳) "ہم نے اپنے اسلاف کو اس راستے پہ چلتے دیکھا ہے اس لئے ہم انہی کے نقوشِ قدم پہ چلتے جائیں گے۔"

یہی ہے (ہمارا) وہ راہ گم کردہ قافلہ (مسلمانوں کی قوم) جن سے کہا گیا ہے کہ تمہاری بازآفرینی (توبہ) کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ تم اس فریبِ نفس سے نکل جاؤ کہ تم صاحبِ ایمان ہو۔ تمہیں از سرِ نو ایمان لانا ہوگا۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ (۴/۱۳۶)۔ اے وہ جو اپنے آپ کو مومن سمجھتے ہو، تم ایمان لاؤ اللہ پہ۔ اس کے رسول پہ اور اس کتاب پہ جسے خدا نے اپنے رسول پر نازل کیا تھا۔ اس ایمان کے معنی یہ ہیں کہ صحیح اور غلط راستے کا معیار خدا کی کتاب کو قرار دو۔

یہ ہے مسلمانوں کی قوم کی اجتماعی توبہ کا عملی مفہوم۔

---

(۹) یہ بھی اسلام وہ بھی اسلام

سنہ ۱۹۸۰ء کا ذکر ہے کسی صاحب نے وفاقی شرعی عدالت سے کہا کہ پاکستان میں سیاسی پارٹیوں کو ممنوع قرار دیا جائے کیونکہ یہ غیر اسلامی ہیں۔ عدالت نے اس درخواست کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ

اسلام کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست میں سیاسی پارٹیاں موجود تھیں۔ ("دی مسلم" مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۹۸۰ء بحوالہ طلوعِ اسلام جنوری سنہ ۱۹۸۱ء)

اب روزنامہ ڈان (کراچی) کی ۲۰ اگست سنہ ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

فیڈرل شریعت کورٹ کے چیف جسٹس شیخ آفتاب حسین صاحب نے نمائندہ ڈان سے دورانِ گفتگو کہا کہ سیاسی پارٹیوں کو ممنوع قرار دینے کا قانون، اسلامی نقطۂ خیال سے بالکل جائز ہوگا۔ بشرطیکہ یہ مفادِ عامہ میں ہو اور اس سے فتنہ فساد کا ازالہ ہو جائے۔

یہ ہے فقہی قوانین کی حقیقت، خواہ وہ ہزار سال پہلے کے ہوں یا اب مرتب ہوئے ہوں۔

---

(۱۰) ذرا سوچیئے

جرمِ قتل کی سزا (دیت اور قصاص) کے متعلق اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنی رپورٹ مرتب کر کے سنہ ۱۹۸۰ء میں پیش کر دی (وہ رپورٹ کب سے زیرِ ترتیب تھی اس کا ہمیں علم نہیں)۔ چار سال تک وہ رپورٹ مختلف منتخبہ کمیٹیوں

کے ہاں چکر لگاتی رہی۔ آخر کار مجلسِ شوریٰ نے اسے منظوری کے صدرِ مملکت کے پاس بھیجدیا۔ اس میں بھی متنازعہ فیہ سوال (یعنی عورت کی دیت کا مسئلہ) لاینحل چھوڑ دیا گیا ہے کہ اسے سپریم کورٹ طے کر دے گی۔ کراچی سے شائع ہونے والے انگریزی اخبار (STAR) کی ۱۳ راگست کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ صدرِ مملکت نے صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ دیت اور قصاص کے مسئلہ پر وہ مختلف علماء سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں جن میں پاکستان، عرب، یورپ کی بعض نامور شخصیتوں کا نام لیا گیا ہے۔ گویا اب بھی یہ سوال فیصلہ کن مرحلہ پر نہیں پہنچا۔ ابھی یہ مزید مشورہ اور غور و خوض کا محتاج ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ جب یہ سطور قارئین کی نظروں سے گذریں اس وقت تک اس باب میں مزید پیش رفت کیا ہوگی۔ لیکن اس وقت تک تو بہرحال واضح ہے کہ پانچ چار سال کے عرصہ میں یہ طے نہیں پاسکا کہ اسلام کی رُو سے جرم قتل کی سزا کیا ہوگی؟ یہ تو بہرحال ظاہر ہے کہ اس تمام عرصہ میں یہ شرط لازم تھی کہ قانون کتاب و سنّت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ دوسرے الفاظ میں حقیقت یہ سامنے آئی کہ کتاب و سنّت کی صورت یہ ہے کہ وہ سالہا سال کی کاوشوں کے باوجود ایک قانون کے متعلق بھی کوئی متفق علیہ فیصلہ نہیں دے سکی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ قانون کب بنے گا۔ اور جب بنے گا تو حدود کے قوانین جیسا ہی ہوگا۔ جن کے متعلق خود صدرِ مملکت نے فرمایا تھا کہ وہ ناممکن العمل ہیں۔

لیکن اس دوران میں کیا اربابِ فکر و نظر کے لئے یہ سوچنے کا مقام نہیں کہ ہماری قانون سازی کی مہم میں وہ بنیادی سقم کیا ہے جس سے یہ صورت پیدا ہو رہی ہے۔ اس سوال کا جواب اگر قرآن سے پوچھا جاتا تو وہ دو فقروں میں اس کا حل بتا دیتا۔ اور حل بھی ایسا جس میں کوئی اختلاف نہ ہوتا کیونکہ اس کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں (۴/۸۲) اور وہ اسلامی قانون ہوتا۔ کیونکہ خود خدا نے فرما دیا ہے کہ اسلامی قانون وہی ہے جو کتاب اللہ کے مطابق ہو۔ (۵/۴۴)

لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت قوم کو کبھی اس طرف آنے نہیں دے گی! یہ صورتِ حالات اس وقت تک باقی رہے گی جب تک کوئی قرآنی مملکت وجود میں نہیں آتی۔ ایسی مملکت ان تمام (اور دیگر مروجہ) قوانین کا جائزہ، قرآن کی روشنی میں لے گی اور جو قوانین اس (قرآن) کے خلاف ہوں گے انہیں منسوخ کر کے ان کی جگہ قرآنی قوانین نافذ کر دے گی۔ اس نکتہ کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھیئے کہ جو قانون قرآن کے مطابق ہوگا وہی سنّت کے بھی مطابق ہوگا کیونکہ خود رسول اللہؐ کو بھی حکم دیا گیا تھا کہ وہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے دیں (۵/۴۸) لہٰذا جو قانون قرآن کے مطابق ہوگا وہ از خود کتاب و سنّت کے مطابق ہونے کی شرط پوری کر دے گا۔ اور جو قرآن کے خلاف ہوگا وہ سنّت کے بھی خلاف ہوگا۔

ایک درس

حج کا مقصد

پرویز

آپ نے یہ الفاظ ہر محراب و منبر اور ہر سٹیج اور پلیٹ فارم سے سُنے ہوں گے، اور بار بار سُنے ہوں گے کہ اسلام نوعِ انسان کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ الفاظ تو آپ نے بارہا سُنے ہوں گے، لیکن یہ کسی کی زبان سے نہیں سُنا ہوگا کہ نوعِ انسان کی مشکلات کیا ہیں اور اسلام ان کا حل کیا پیش کرتا ہے؟ اصل یہ ہے کہ جو قوم خود اپنی مشکلات کا حل دریافت نہ کر سکتی ہو ـــــ اس کے لئے اُسے غیروں کے در وازے پر دستک دینی پڑتی ہو ـــــ وہ نوعِ انسان کی مشکلات کا حل کیا پیش کر سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جب غیر اقوام ہمارا یہ دعویٰ سُنتی ہیں تو استہزاء کی ہنسی ہنس کر کہتی ہیں کہ پہلے اپنی مشکلات کو تو حل کر لو، اس کے بعد نوعِ انسان کی مشکلات کے حل کا دعویٰ کرنا!

یہ درحقیقت "مذہب" کی ٹیکنیک ہے کہ وہ نہایت مقدّس اور خوش آئند الفاظ کے ذریعے اپنے معتقدین کو خوش فہمی میں مبتلا رکھتا ہے اور اُن کے ذہن کو کبھی اس طرف نہیں آنے دیتا کہ وہ ان الفاظ کا مفہوم معلوم کریں یا یہ سوچیں کہ ہم جو دعویٰ کرتے ہیں اُس کا عملی ثبوت کیا ہے۔ مذہب کا سارا دار و مدار بلا مفہوم الفاظ کے دہرائے چلے جانے اور بلا نتیجہ رسومات ادا کئے جانے پر ہوتا ہے۔ چونکہ اسلام بھی الدّین نہیں رہا، مذہب بن چکا ہے، اس لئے ہم بھی نہ الفاظ کے مفہوم کی طرف آتے ہیں اور نہ ہی اپنے دعاوی کے عملی ثبوت کی طرف۔

اِس وقت تمام اقوامِ عالم گوناگوں مشکلات کا شکار ہیں۔ میں ان میں سے ایک ایک پرابلم کا حل "قرآنِ مجید" کی روشنی میں پیش کئے چلا آرہا ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ میری یہ کوشش قرآنی الفاظ، اصطلاحات، اور تصوّرات و نظریات کا متعیّن مفہوم پیش کرنے تک محدود ہے۔ عملی نتائج سے اس کے دعاوی کا ثبوت بہم پہنچانا میرے بس کی بات نہیں کیونکہ وہ ثبوت تو قرآنی نظام کے قیام ہی سے بہم پہنچ سکتا ہے، اور نظام کا قیام کسی فرد کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یہ اُمّت کی اجتماعی کوششوں ہی سے ممکن ہوتا ہے۔ بایں ہمہ میں شروع ہی سے اپنی ان کوششوں کو جاری رکھے ہوئے ہوں۔ ایک تو اس لئے کہ قوم کے اربابِ بصیرت اس حقیقت کو سمجھ سکیں کہ اس وقت ہم میں جو کچھ اسلام کے نام سے ہو رہا ہے وہ مذہب ہے، دین نہیں۔ اور دوسرے اس لئے کہ اس سے شاید آنے والی نسلیں استفادہ کر کے دین کا نظام قائم

کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے اقوامِ عالم متعدد گوناگوں مشکلات اور پریشانیوں کا شکار ہیں ..... میں اس وقت ان میں سے صرف ایک مسئلہ کو لوں گا جو درحقیقت مشکل ترین مسئلہ ہے اور نوعِ انسان کے موجودہ مصائب اور ممکنہ تباہی کا موجب ہے۔ اور وہ ہے نیشنلزم۔ میں اس موضوع پر اس سے پہلے بھی بہت کچھ لکھ چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ خود اقوامِ مغرب اس کے ہاتھوں کس قدر نالاں ہیں اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کس قدر مضطرب و بے قرار۔ لیکن انہیں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میں اس نشست میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ قرآنِ کریم نے اس کا فطری حل کیا بتایا اور عملی پروگرام کیا تجویز کیا۔

(۱)

نوعِ انسان کی تمدنی یا معاشرتی زندگی کی ابتدا کب اور کہاں سے ہوئی، مغرب کے علماء علم الانسان نے اس باب میں خاصی تحقیق کی ہے لیکن وہ اس باب میں ابھی تک کسی متعین نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ قرآنِ کریم اس قسم کی تحقیقات کے متعلق بحث نہیں کرتا۔ وہ بات اس مقام سے شروع کرتا ہے جو اس کے پیشِ نظر منزل تک پہنچنے کا آغازِ سفر ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ط ..... ۵ (۱۰/۱۹) "نوعِ انسان شروع میں ایک اُمّت، ایک جماعت، ایک گروہ تھی۔ اس کے بعد انہوں نے آپس میں اختلاف پیدا کر لئے۔" ان اختلافات کا نتیجہ تھا کہ وہ پہلے مختلف خاندانوں میں اور اس کے بعد قبیلوں میں بٹ گئے اور اس تفریق کو نسلوں تک پھیلا دیا۔ باہمی تقسیم اور تفریق کی یہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ تا آنکہ اس نے مختلف قوموں کی شکل اختیار کر لی۔ رفتہ رفتہ اس نے ایک سیاسی تصورِ حیات یا مسلکِ زندگی کا پیرہن اوڑھ لیا۔ اس کا نام نیشنلزم ہے جو اس وقت پوری کی پوری نوعِ انسان کو محیط ہے۔ اس سے نہ کرۂ ارض، کرۂ ارض رہا ہے اور نہ ہی انسان، نوعِ انسانی کا فرد۔ کرۂ ارض کو فرضی لکیریں کھینچ کر مختلف ممالک میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ان ممالک میں بسنے والے انسانوں کو مختلف قوموں کا نام دے دیا گیا۔ یہ قومیں بھیڑیوں کی طرح تاک میں بیٹھی رہتی ہیں کہ ان میں سے کسی کو کب اونگھ آئے اور یہ اس پر جھپٹ پڑیں۔ اس وقت پوری نوعِ انسان کی یہی کیفیت ہے، اس میں نہ اقوامِ مغرب کی تخصیص ہے اور نہ اقوامِ مشرق کی تمیز۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

نیشنلزم

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس ۔ مشرق کے ثوابت ہوں کہ مغرب کے سیّار

قرآنِ کریم نے بتایا کہ نوعِ انسان اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی جس مصیبت کا شکار ہو گئی تھی اس سے نجات دلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے وحی کی راہنمائی کا آغاز کیا۔ سورۂ بقرہ میں ہے :-

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً قف فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ
وَمُنْذِرِيْنَ ص وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا

اخْتَلَفُوْا فِیْهِ ط ٥ (۲/۲۱۳)

چونکہ نوعِ انسان کو پھر سے ایک وحدت میں تبدیل کرنا مقصود تھا، اس لئے اللہ تعالےٰ نے بعثتِ انبیاء کا سلسلہ شروع کیا جو انہیں اختلافی زندگی کے تباہ کن عواقب سے آگاہ کرتے اور ایک برادری بن کر رہنے کی زندگی کے خوشگوار ثمرات کی خوشخبری سناتے۔ وہ اپنے ساتھ قوانینِ خداوندی کا ضابطہ لاتے تاکہ وہ اُس کی رُو سے ان کے اختلافی امور کا فیصلہ کریں۔

یہ تھا وحی کا مقصد اور وہ منزل جس تک کاروانِ انسانیت کو پہنچانا مقصود تھا۔ یعنی انہیں ایک عالمگیر برادری کے قالب میں ڈھالنا۔ اس کے لئے وحی نے کہا کہ جو لوگ اس مقصد سے متفق ہیں وہ، رنگ، نسل، زبان، وطن اور قومیت کے اختلاف کے باوجود ایک اُمّت کے افراد ہیں۔ جو اس سے انکار کرتے ہیں وہ ان کے بالمقابل دوسری اُمّت کے افراد۔ اسی کو ایمان اور کفر کے امتیاز سے تعبیر کیا گیا ہے، اور سیاسی اصطلاح میں اسے "دو قومی نظریہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

عالمگیر برادری

اگرچہ ہر نبی کا یہی پیغام تھا، لیکن اس کی عملی تشکیل حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں وجود پذیر ہوئی۔ اُنہوں نے ماں باپ، برادری، قوم، اور وطن تک کو چھوڑ کر ایمان کی بنیادوں پر ایک نئی اُمّت کی تشکیل کی اور اُس کا ایک اجتماعی نظام قائم کیا۔ نظام یا اجتماعیت کے لئے ایک محسوس مرکز کا وجود لاینفک ہوتا ہے۔ انہوں نے وحیِ خداوندی کی راہنمائی میں مکّہ کے مقام پر ایک علامتی مرکز تعمیر کیا، جسے کعبہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ مُبٰرَکًا وَّهُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ٥ (۳/۹۶)

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں سب سے پہلا گھر جو قوم، وطن، رنگ، نسل کے امتیازات سے بلند ہو کر خالص انسانیت کے لئے وجود میں لایا گیا تھا، مکّہ کی مبارک وادی میں (خانۂ کعبہ) تھا۔ یہ کاروانِ انسانیت کی منزلِ مقصود کے لئے نشانِ راہ تھا۔

اسے، تمام انسانی نسبتوں سے بلند و بالا قرار دینے کے لئے، اللہ تعالےٰ نے "اپنا گھر" (بَیْتِیَ۔ ۲/۱۲۵) کہہ کر پکارا۔ یہاں ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے، اور وہ یہ کہ ویسے تو کائنات کی ہر شے خدا ہی کی ہے۔ لیکن اس نے جس چیز کو خاص طور پر "اپنی" کہہ کر پکارا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی، نہ اس پر کسی کا قبضہ ہو سکتا ہے۔ (مثلاً) بیت اللہ (اللہ کا گھر) یا ارض اللہ (اللہ کی زمین)۔

مندرجہ بالا آیت میں کہا گیا ہے کہ کعبہ کو النّاس (نوعِ انسان) کی اجتماعیت کا مرکز بنایا گیا۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ کعبہ اور حج کے سلسلے میں جس قدر آیات قرآنِ کریم میں آئی ہیں اُن میں ہر جگہ "النّاس" ہی کہا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، وحیِ خداوندی کا مقصود و مطلوب

لِلنّاس کا مقصد

نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کی تشکیل تھا۔ اس لئے جس مقام کو اس برادری کا مرکز قرار دیا گیا اسے "لِلنّاس" ہی کہا جانا چاہیئے تھا۔ اور یہی قرآن نے کیا۔

اب یہ دیکھئے کہ نوعِ انسان کی اس مرکزیت سے مقصود کیا تھا۔ فرمایا:۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ ...... (5/97)

اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو واجب الاحترام مقام قرار دیا تاکہ اس مرکزیت سے نوعِ انسان اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو سکے۔

یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے دو لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے۔ انسانیت، قوموں میں تقسیم ہو تو وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر آج دنیا کی قومیں دو حصوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ ایک سپر پاورز ——— یعنی بڑی مہیب قوتوں کی مالک قومیں۔ اور دوسری، کمزور اور غیر نشوونما یافتہ (UNDEVELOPED) قومیں۔ کمزور قوموں کا طاقتور قوموں کے سہارے کا محتاج ہونا تو ظاہر ہے۔ یہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو ہی نہیں سکتیں۔ لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ خود سپر پاورز اپنی قوت کے لئے ان کمزور قوموں کی محتاج ہوتی ہیں۔ جس قوم کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کمزور قومیں ہوں، وہ اتنی ہی زیادہ طاقتور سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بڑی قوم کی یہ انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ان کمزور قوموں کو زیادہ سے زیادہ امداد یا امداد کا لالچ دے کر اپنے ساتھ رکھ سکیں، لیکن ایسا کبھی نہ ہونے دیں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکیں۔

لیکن اگر قومیتوں کے مٹ جانے کے بعد نوعِ انسان اُمّتِ واحدہ بن جائے تو اسے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لئے کسی خارجی سہارے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ یہ ہے کعبے کی مرکزیت کا اوّلین ثمرہ۔ یعنی قیاماً لِلنّاس۔ نوعِ انسان کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا ذریعہ۔

اب آگے بڑھیئے۔ اس وقت دنیا میں کہیں امن نہیں۔ چھوٹی قومیں ہوں یا بڑی، سب ایک دوسرے سے ڈری اور سہمی ہوئی رہتی ہیں۔ جب قوموں کی یہ حالت ہے تو افراد، خوف و ہراس کے جس جہنم میں زندگی گذارتے ہیں، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس وسیع و عریض کرۂ ارض پر کوئی چھوٹے سے چھوٹا مامن ایسا نہیں جہاں کوئی فرد یا قوم اپنے آپ کو محفوظ یا مامون سمجھ لے۔ کعبے کی مرکزیت کی دوسری خصوصیت کے متعلق قرآن نے کہا:۔

جائے امن

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ...... (2/125)

اور ہم نے کعبہ کو نوعِ انسان کی اجتماعیت کا مرکز بنایا اور ایسا مقام جہاں کسی کو کسی قسم کا خوف و خطر نہ ہو۔

دوسری جگہ ہے: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ...... (3/96) "جو بھی اس نظام میں داخل ہو جائے گا جس کا یہ مرکز ہے، اُسے امن کی ضمانت مل جائے گی"۔

بات واضح ہے، دنیا میں خوف و خطر تو مختلف قومیتوں کا پیدا کردہ ہے۔ جب اِن کی جگہ ایک ایسی اُمّت وجود میں آجائے گی جس میں یہ تفریق نہیں ہوگی تو وہ بھائیوں کی طرح امن و سلامتی سے رہے گی۔ اسے نہ کسی خارجی خطرہ کا اندیشہ ہوگا، نہ داخلی خلفشار کا ڈر۔ سوچئے کہ اس سے یہ کرّہ ارض جو اس وقت جہنّم زار بن رہا ہے، کیسا امن و سلامتی کی جنّت بن جائے گا!

موجودہ قومیتوں کی تقسیم کی ایک لعنت یہ بھی ہے کہ کسی ایک ملک کا باشندہ، دوسرے ملک میں قدم تک نہیں رکھ سکتا جب تک وہ اس سے اجازت نامہ (VISA) حاصل نہ کرلے۔ کعبہ کے متعلق کہا:۔

جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ..... (۲۲/۲۵)

یہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے، اس گھر کے دروازے سب کے لئے یکساں طور پہ کھلے ہیں، کسی کو یہاں آنے کی ممانعت نہیں، کسی سے اجازت نامہ حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ تمام انسانوں کے خدا (ربّ النّاس) کا گھر ہے، اس لئے اس کے دروازے ہر انسان کے لئے کھلے رہیں گے۔

یہی نہیں کہ جس کا جی چاہے یہاں آجائے۔ حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کعبہ کے بعد دعا یہ مانگی تھی کہ اس خطۂ زمین میں کچھ پیدا نہیں ہوتا جو لوگوں کے لئے وجہ کشش ہوسکے۔ بارالہا! تو ایسا کردے کہ لوگوں کے دل اس طرف مائل ہوجائیں اور وہ فوج در فوج اِدھر آنے لگ جائیں۔ (۱۴/۳۷)۔

یہ تھیں اس گھر کی خصوصیات جسے تمام نوعِ انسان کے لئے مرکز قرار دیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ خصوصیات مٹی اور پتھر کے کسی مقام یا گھر کی نہیں۔ یہ خصوصیات، اس نظام کی ہیں جس کا مرکز یہ گھر قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح (مثلاً) ہم کہتے ہیں کہ ماسکو کی پالیسی یہ ہے اور واشنگٹن نے یہ طے کیا ہے تو اس سے مراد ماسکو اور واشنگٹن کے شہر نہیں ہوتے۔ اس سے مراد وہ مملکتیں ہوتی ہیں جن کے یہ شہر مراکز ہیں۔

اسی طرح "کعبہ" سے مراد وہ نظامِ خداوندی وہ قرآنی مملکت ہے، جس کا یہ مرکزی مقام ہے۔

(۸)

حضرت ابراہیمؑ کے مقدّس ہاتھوں اس مرکز کی تعمیر ہوئی۔ اس کے بعد آپ، صدیوں پر پھیلے ہوئے تاریخ کے اوراق کو الٹ کر، چھٹی صدی عیسوی میں آجایئے جہاں وہ نظام اپنی مکمل شکل میں قائم ہوا جس کا مرکز کعبہ تھا۔ اس نظام کے قیام کے لئے سب سے پہلے ایک اُمّت تشکیل کی گئی جو رنگ، نسل، خون، وطن کے امتیازات کو مٹا کر خالص ایمان کی بنیادوں پر وجود میں آئی تھی۔ اس اُمّت کے وجود کا مقصد کیا تھا، اسے قرآن نے ان چند الفاظ میں نہایت جامعیت سے بیان کردیا جب کہا کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ...... (۳/۱۰۹) "تم وہ بہترین اُمّت ہو جسے نوعِ انسان کے لئے پیدا

کیا گیا ہے۔ غور کیجئے! جس طرح کعبہ کا مقصد نوعِ انسان کی فلاح و بہبود تھا اُسی طرح اس اُمّت کی بعثت کا مقصد بھی پوری کی پوری انسانیت (لِلنَّاس) کی خیر طلبی، تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس اُمّت نے ایک نظام قائم کیا۔ اس نظام کی رُو سے اس اُمّت کا فریضہ یہ قرار دیا گیا کہ

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۔۔۔۔۔۔ (۲/۱۴۳)

اس طرح ہم نے تمہیں ایک ایسی اُمّت بنایا جو تمام نوعِ انسانی سے یکساں فاصلے پر رہے۔ نہ کسی کی طرف یونہی جھکی ہوئی، نہ کسی سے یونہی کھنچی ہوئی۔ فریضہ تمہارا یہ ہے کہ تم نوعِ انسانی پہ نگاہ رکھو کہ اس کا قدم غلط سمت کی طرف نہ اُٹھنے پائے۔ اور تم پہ تمہارے نظام کی مرکزی اتھارٹی (رسول) نگاہ رکھے کہ تم غلط راستہ اختیار نہ کر لو۔

یہاں پھر "شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ" کہا گیا ہے۔ یعنی تمام نوعِ انسان پر نگران۔ ان خصوصیات کی حامل اُمّت کو "ملّتِ ابراہیمی" (۲۲/۷۸) کی پیروکار کہہ کر پکارا گیا۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ کی روش پر چلنے والی اُمّت۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کہا گیا تھا: اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (۲/۱۲۴) "نوعِ انسان کی امامت (LEADERSHIP) تمہارے حصّے میں آئے گی"۔ اور اسی بنا پر اس اُمّت سے کہا: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۔۔۔۔۔۔ (۲/۱۲۵) "تم منصب و مقامِ ابراہیمی کے حصول کو اپنی تگ و تاز کی جولان نگاہ بناؤ"۔ یعنی جس طرح حضرت ابراہیمؑ کو نوعِ انسان کی امامت کا سزاوار قرار دیا گیا تھا اسی طرح تم بھی اس نظام کے قیام سے، جس کا مرکز کعبہ ہے، عالمگیر انسانیت کی لیڈرشپ حاصل کرو۔

اس اُمّت نے جو نظام قائم کیا تھا، اس کی بنیاد باہمی مشاورت پہ تھی۔ (۴۲/۳۸)۔ اس مشاورت کی روزمرّہ کی شکل تو صلوٰۃ کے اجتماعات تھے ۔۔۔۔۔۔ آپ غور کیجئے کہ مشاورت کا حکم اور اقامتِ صلوٰۃ کا حکم ایک ہی سانس میں دیا گیا ہے۔ (۴۲/۳۸) لیکن پوری مملکت کے مسائل کے لئے مشاورت کے اجتماعات اس سے کہیں زیادہ وسیع (بلکہ عالمگیر) پیمانے پر ہونے ضروری تھے۔ اُمّت کے اس عالمگیر اجتماع کو حج کہہ کر پکارا گیا ۔۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ نسبتاً چھوٹے

حج

پیمانے پر جو اجتماعات منعقد کئے جانے ضروری تھے انہیں عمرہ کہا گیا۔ اس اجتماعِ عظیم کا آغاز بھی حضرت ابراہیمؑ نے کیا تھا جب انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ ۔۔۔۔ (۲۲/۲۷) "تم اعلان کر دو، تمام انسانوں کو دعوت دو کہ وہ حج کے اجتماع میں شرکت کے لئے آئیں"۔ اس اُسوۂ ابراہیمی کے اتباع میں اس اُمّت پر بھی یہ فریضہ عائد ہو گیا کہ وہ ان اجتماعات کے انعقاد کا اہتمام کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ اجتماعات اصلاً تو اُمّت کی باہمی مشاورت کے لئے ہوں گے، لیکن ان میں شرکت کے لئے تمام انسانوں (النَّاس) کو دعوت دی گئی ہے۔ یہ بحیثیت مبصّر شریک ہوں گے۔ اس سے مقصد کیا ہے، اس کے متعلق ہم آگے چل کر وضاحت کریں گے۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہو گا کہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا تھا

کہ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ ...... (۲۲/۲۷) "حج کے لئے تمام لوگوں کو دعوت دو"۔ اسی طرح امتِ مسلمہ کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے حج کے متعلق بھی کہا کہ وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا ...... (۳/۹۶) "جو لوگ بھی (اَلنَّاس) وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں انہیں چاہیئے کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے جنہیں خدا نے مقرر کیا ہے (لِلّٰہ) حج کے اجتماع میں شرکت کریں"۔ آپ غور کیجئے کہ یہاں بھی اَلنَّاس کہا ہے، اسے مؤمنین (مسلمانوں) تک محدود نہیں رکھا گیا۔

عربوں کے ہاں حج کا اجتماع زمانہ قبل از اسلام میں بھی ہوتا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرت ابراہیمؑ تعمیرِ کعبہ[۱] سے فارغ ہوئے ہیں تو ان سے کہا گیا تھا کہ حج کے اجتماع کا اہتمام کریں اور لوگوں کو اس میں شرکت کی دعوت دیں۔ لیکن جس طرح، جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کے بلند و بالا پروگرام کے عملی اجزاء، بے معنی رسومات بن کر رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح عربوں میں حج کے اجتماع نے بھی (کم و بیش) ایک میلہ کی شکل اختیار کر رکھی تھی، اور حجِ ابراہیمیؑ کے مناسک اور شعائر، مشرکانہ اور فاسقانہ (بلکہ جاہلانہ) رسوم بن کر رہ گئے تھے، بایں ہمہ اسے اہمیت بڑی حاصل تھی۔ اس اعتبار سے، تمام عربوں کی عمرانی زندگی کا مرکز تھا، اور قریش کو اس کی تولیت کی وجہ سے خاص امتیازی پوزیشن حاصل تھی۔ مادہ کے اعتبار سے اس لفظ (حج) کے معنی قصد و ارادہ کے بھی ہیں اور روک دینے کے بھی۔ زمانہ قبل از اسلام میں حج کے اجتماع میں، علاوہ دیگر امور، قبائل کے باہمی جھگڑے نپٹائے جاتے تھے اور زیادتی کرنے والوں کو ان کی دراز دستیوں سے روکا جاتا تھا۔ لیکن یہ روکنا تلوار کے ذریعے نہیں ہوتا تھا، دلائل و براہین کی رُو سے ہوتا تھا۔ یہیں سے لفظ حُجّت ہے جس کے معنی "دلیل" کے ہیں۔ اِس جہت سے قرآن دلائل کو اَلْحُجَّۃُ الْبَالِغَۃُ ... (۶/۱۴۹) کہا گیا ہے۔ اِس لفظ کے اِن بنیادی معانی اور تصورات سے اس اجتماع کا مقصد سامنے آجاتا ہے۔ یعنی دلائل و براہین پر مبنی مشاورت سے مملکت کے معاملات کا حل تلاش کرنا، اور غلط کاروں کو ان کے اقدامات سے روکنے کی تدابیر سوچنا۔

قرآن کریم نے عربوں کے اس اجتماع کو نہ صرف باقی رکھا، بلکہ اسے دین کے نظام میں ایک بنیادی ستون قرار دیا۔ فتح مکہ سے پہلے (سنہ ۸ھ تک) کعبہ (کفار) قریش کی تحویل میں تھا اِس لئے وہاں قرآنی انداز کے اجتماع (حج) کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فتحِ مکہ کے بعد، سنہ ۸ھ کا حج تو کم و بیش سابقہ

حج اسلام

روش پر ادا ہوا۔ لیکن سنہ ۹ھ میں اسے قرآنی شکل دے دی گئی۔ اِس پر حضورؐ خود تو تشریف نہیں لے گئے، لیکن حضرت ابوبکرؓ صدیق کو نمائندہ مملکتِ قرآنیہ

---

[۱] ایسا نظر آتا ہے کہ یہ مکان حضرت ابراہیمؑ سے بھی پہلے (کسی زمانے میں) تعمیر ہوا تھا لیکن بعد میں بہ مرورِ زمانہ کھنڈر بن گیا اور اس کی صرف بنیادوں کے نشانات باقی رہ گئے تھے جن پر حضرت ابراہیمؑ نے دیواریں کھڑی کی تھیں۔ (۲/۱۲۷)۔

کی حیثیت سے، قافلہ حجاج کا سربراہ بنا کر بھیجا۔ اس اجتماع میں کم و بیش تمام سابقہ رسوم و مناسک کو برقرار رکھا، لیکن انہیں مشرکانہ اور جاہلانہ آمیزشوں سے پاک اور صاف کر کے۔ اس سے پہلے حج کی سب سے بڑی خصوصیت وہ اعلانِ عظیم تھا جو مدینہ کی اسلامی مملکت کی طرف سے، غیر مسلموں (بالخصوص قریش) کے ساتھ تعلقات کا منشور تھا اور جو سورۂ توبہ میں مذکور ہے۔ سنہ ۱۰ھ میں یہ اجتماع خود ذاتِ رسالتمآبؐ کے زیرِ لوا منعقد ہوا اور اس میں حضورؐ نے وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو عالمگیر انسانیت کے لئے صحیفۂ آزادی قرار پاتا ہے۔ اس کا نقطۂ ماسکہ یہ تھا کہ انسانوں کے خود ساختہ، رنگ، نسل، خون، زبان، وطن، قومیت، ذات پات، برادری، قبائل، ہر قسم کے امتیازات کو مٹا کر، خالص ایمان کی بنیادوں پر، انسانوں کی عالمگیر برادری کی تشکیل۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں بھی یہ اجتماع، انہی مقاصدِ عالیہ کے حصول کا ذریعہ تھا جنہیں قرآن نے متعین فرمایا تھا۔ اس میں وسیع و عریض مملکتِ اسلامیہ کے نمائندگان شریک ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ ان لوگوں کو بھی خصوصی دعوت دی جاتی تھی جنہیں ارکانِ عمالِ حکومت کے خلاف کسی قسم کی شکایت ہوتی۔ چونکہ یہ اجتماع مملکت کے دور دراز علاقوں سے آنے والوں پر مشتمل ہوتا تھا، اس لئے میدانِ عرفات میں ان کا باہمی تعارف ہوتا تھا۔ اسی جہت سے اسے عرفات کہتے تھے۔ (یعنی باہمی تعارف کی تقریب) سربراہِ مملکت یا اُس کا نمائندہ، اپنے خطاب میں اس پروگرام کا اعلان کرتا جو آئندہ سال کے لئے تجویز ہوتا تھا۔ اس کے بعد، یہ نمائندگانِ مملکت، منیٰ کے میدان میں جمع ہوتے۔ وہاں اور تین دن تک قیام کر کے اس پروگرام کی تفصیلات پر غور و خوض کرتے۔ امورِ مملکت کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھایا جاتا۔ مستغیثین کی شکایات کا ازالہ کیا جاتا۔ اور یہ سب کچھ دلائل و حجت کی رُو سے کیا جاتا، دھاندلی اور سینہ زوری سے نہیں۔ ان فیصلوں اور تجویزوں کو ساتھ لے کر، یہ نمائندگان، اپنے اپنے مقامات کی طرف واپس جاتے۔

قربانی؟

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مکہ، اس وادی میں واقع ہے جہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ (۱۴/۳) اس علاقہ میں اگر لاکھوں انسانوں کا اجتماع ہو تو سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوگا کہ ان کے کھانے پینے کا کیا انتظام ہوگا؟ قرآن کریم اس قسم کے اہم سوال کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اس نے کہا کہ اس اجتماع میں شرکت کرنے والے اپنی "خوراک" اپنے ساتھ آپ لائیں ——— اور ظاہر ہے کہ گوشت سے بہتر خوراک کونسی ہو سکتی تھی؟ اس نے کہا کہ یہ آنے والے کچھ فالتو اونٹ اپنے ساتھ لائیں۔ آتے وقت ان پر بے شک سامانِ تجارت وغیرہ لاد لیں، اور یہاں پہنچ کر انہیں ذبح کریں۔ اُن کا گوشت خود بھی کھائیں، اور مکہ کے اُن غرباء کو بھی کھلائیں جنہیں عام حالات میں گوشت نصیب نہیں ہوتا۔ سورۂ حج کی آیات (۲۲/۲۸؛ ۲۲/۳۳؛ ۲۲/۳۶) میں یہ تمام تفصیل درج ہے۔ ان کے لئے قربانی کا لفظ سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ (نہ ہی ان جانوروں کے متعلق جنہیں بقرعید پر، قربانی کہہ کر ذبح کیا جاتا ہے)۔

اس کے بعد حج کے اُس بنیادی مقصد کی طرف آئیے جس کی تشریح کو ہم نے قصداً اس مقام کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ پہلے تمہیداً یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ دین کے مقاصد محض نظری تصوّرات یا ذہنی عقائد نہیں ہوتے، وہ محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں اور دین کے دعاوی کا ایسا عملی ثبوت بنتے ہیں جس سے انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ حج کے سلسلے میں بھی قرآنِ کریم نے اس کا اسی قسم کا مقصد بتایا۔ سورۂ حج میں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ تعمیرِ کعبہ سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا:۔

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّ عَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ۙ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ ...... ۝ (۲۲/۲۷-۲۸)

تم لوگوں میں اعلان کر دو کہ وہ حج کے لئے یہاں آیا کریں —— دنیا کے دور دراز گوشوں سے لمبی لمبی مسافتیں طے کرتے، پا پیادہ یا ایسی سواریوں پر جو سفر کی مشقت سے تھک کر چور ہو جائیں۔

وہ یہاں اس لئے آئیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام اُن کی (یعنی نوعِ انسان کی) منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

نوعِ انسان کی منفعت

اس میں "لِیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ"...... کے الفاظ بڑے گہرے غور و تدبّر کے متقاضی ہیں۔ کہا یہ گیا ہے کہ لوگ آئیں اور اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں کہ یہ نظام ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ مشاہدہ اس چیز کا ہو سکتا ہے جو محسوس طور پر سامنے آجائے۔ یہ دعوت "النّاس" کو دی جاتی تھی جس میں اُمتِ مسلمہ بھی شامل ہے اور غیر مسلم بھی۔ اِس اُمّت کے افراد یہ دیکھ لیں کہ یہ نظام اُن کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے اور غیر مسلم بھی اس کا مشاہدہ کر لیں کہ یہ نظام عالمگیر انسانیت کے لئے کس قدر منفعت بخش ہے۔ یہ نفع سامانیاں بھی ان کے سامنے محسوس شکل میں آئیں گی۔

واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے حسنِ عمل۔ کارِ خیر۔ "ثواب" کے کاموں کے پرکھنے کا ایک ہی معیار بتایا ہے۔ اور وہ یہ کہ وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ ط ...... (۱۳/۱۷) "دنیا میں بقا اسی عمل کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسان (النّاس) کے لئے نفع بخش ہو"۔ دین اور اس کے ارکان و شعائر کی علّتِ غائی یہ ہے کہ ان سے ایسے نتائج مرتب ہوں جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت کا موجب ہوں۔ حج کے اجتماع میں ان منفعت بخش نتائج کو سامنے لایا جاتا تھا، اور اسی کے لئے تمام انسانوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ لِیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ ......

قرآنی نظامِ مملکت میں غیر مسلموں کو شریکِ حکومت تو نہیں کیا جا سکتا، لیکن بعض فنّی اور ٹیکنیکل معاملات میں اُن سے مشورہ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ ایسا کیا کرتے تھے، اور اس زمانے میں غیر مسلم مکّے میں آیا جایا کرتے تھے۔ (کتاب الخراج، امام یوسفؒ۔ بحوالہ شبلی نعمانیؒ)۔ غیر مسلموں کو حج کے اجتماع میں مُبصر کی حیثیت سے شریک ہونے کی دعوت دی جائے گی تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام اُن کی بہبود کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

لیکن اس کے لئے ایک شرط ضروری ہے، اور وہ یہ کہ اس میں کوئی شخص کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا جو ان مقاصد کے خلاف جائے جنہیں خدا نے مقرر کیا ہے۔ ایسا کرنے کو شرک سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۲۲/۳۱)۔ اسی بنا پر مشرکینِ مکہ کو اس میں شرکت سے روک دیا گیا تھا۔ (۹/۳ ، ۹/۲۸)۔

بہرحال مقصد اس اجتماع سے یہ تھا کہ نوعِ انسان کو بتایا اور دکھایا جائے کہ قرآنی نظام ان کی منفعت اور بہبود کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

—— (۰) ——

ہمارا حج

یہ تھا اجتماعِ حج کا مقصد۔ اُس زمانے میں دین اپنی اصلی شکل میں موجود تھا، لیکن جب وہ مذہب میں تبدیل ہو گیا تو اس کے مقاصد نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ مذہب کرتا یہ ہے کہ دین کی روح (مقصد اور غایت) کو فنا کر دیتا ہے لیکن اس کے شعائر اور مناسک کو علیٰ حالہٖ برقرار رکھتا ہے، اور ان کی رسمی پابندی پر بڑا زور دیتا ہے۔ اس سے قوم اس خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہے کہ احکام خداوندی کا اتباع ہو رہا ہے۔ اس سے انہیں ایک عقیدتمندانہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے جو اُن کے اپنے ہی دل کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر عوام ان رسوم و مناسک کی انتہائی جذب و عقیدت سے پابندی کئے جاتے ہیں، یہ دیکھے بغیر کہ ان کا کوئی نتیجہ بھی برآمد ہو رہا ہے یا نہیں۔ اسی میں مذہب کی کامیابی کا راز پنہاں ہے۔ لوگ اگر سوچنے لگ جائیں تو مذہب کے مفاد و مفاصد ختم ہو جاتے ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ موجودہ حج پر نگاہ ڈالیں اور سوچیں کہ کیا اس سے وہ مقاصد حاصل ہوتے ہیں جن کے لئے اس کا انعقاد ضروری قرار دیا گیا تھا۔ بات یہاں سے چلی تھی کہ وحی کی غایت اور انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ رنگ، نسل، زبان، خون، وطن اور قومیت کے اختلافات کو مٹا کر (جن کی وجہ سے نوعِ انسان ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے) اُسے پھر سے ایک عالمگیر برادری کے قالب میں ڈھال دیا جائے۔ اس کے لئے ایک نظام تجویز ہوا تھا جس کا مرکز کعبہ تھا، اور جس کے اجتماع کا نام حج تھا۔ حج کا اجتماع اب بھی ہوتا ہے، اور پہلے سے کہیں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ وسیع تر پیمانے پر۔ ایک ایک اجتماع میں پندرہ پندرہ، بیس بیس لاکھ حاجی شریک ہوتے ہیں۔ چالیس، پچاس ہزار کا انبوہِ عظیم تو صرف پاکستان سے اس میں شرکت کے لئے جاتا ہے۔ حکومت کا ایک پورا محکمہ اس کے انتظامات کے لئے وقف ہے۔ وہ سال بھر اسی میں مصروف رہتا ہے۔ ان چالیس، پچاس ہزار حاجیوں کے لئے (مملکت کا انتہائی مشکلوں سے حاصل کردہ) زرِ مبادلہ جس قدر صرف ہوتا ہے، وہ ظاہر ہے۔ یہ حاجی، شدت کی گرمی اور دیگر ناسازگار حالات میں سفر کی صعوبات برداشت کرتے ہیں اور مہینوں لگ جاتے ہیں جن میں وہ کوئی اور کام ہی نہیں کر پاتے۔

وقت، توانائی، روپیہ کے اس صرف اور اس قدر جانکاہ مشقتوں کا حاصل کیا ہوتا ہے؟ ان افراد کا جذباتی اطمینان کہ ہم نے ایک فریضہ ادا کر لیا ہے۔ محض افراد کا جذباتی اطمینان تو کوئی ایسی خصوصیت

نہیں جس کی بنا پر اسلام کو ایک منفرد نظامِ حیات قرار دیا جا سکے! اِس قسم کا اطمینان تو تمام اہلِ مذاہب اپنے اپنے طور پر حاصل کر سکتے اور کر لیتے ہیں!

علاوہ ازیں دنیا کے تمام مسلمان اُسی طرح مختلف قوموں اور وطنوں میں منقسم ہیں جس طرح غیر مسلم۔ ان ممالک اور اقوام کے افرادِ حج کے اجتماع میں بھی اپنے اپنے وطنی اور قومی تشخص کو برقرار رکھتے ہیں۔ مذہبی تفریق اس پر مستزاد ہے۔ اِس کی شدت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ چند سال ادھر کی بات ہے کہ پاکستان کے ایک بہت بڑے مذہبی رہنما نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ ہم تو حرمِ کعبہ میں بھی، امامِ کعبہ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے ——— اپنی جماعت الگ کرتے ہیں۔

یہ ہے کیفیت ہمارے اس اجتماع کی جس کا مقصد وطنوں اور قومیتوں کے امتیازات کو مٹا کر تمام نوعِ انسان کو ایک مرکز پر جمع کرنا تھا۔ دین جب اپنی اصلی شکل میں موجود تھا تو مسلمانوں کا ارجح تو ایک طرف) نمازوں تک میں اجتماع مخالفین کے دلوں میں دھڑکن پیدا کر دیا کرتا تھا اب کیفیت یہ ہے کہ مسلمانوں کے قریب ایک ارب آبادی کے بحرِ ذخار میں اسرائیلی مملکت کی حیثیت خس و خاشاک سے زیادہ نہیں۔ سالہا سال سے لاکھوں کا یہ اجتماع عرفات کے میدان میں رو رو کر خدا سے فریاد کرتا چلا آ رہا ہے کہ غاصب اور مغضوب علیہ اسرائیل کا بیڑا غرق ہو، اور اسرائیل ہے کہ مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ہے "مذہب کے حج" کا نتیجہ۔ الدین کا حج ہوتا تو اس کے صرف اعلان پر دنیا کی ٹڈی دل سے بڑی غلط کوش قوم کی کپکپانے لگ جاتی! اب یہ اُمت غیر مسلموں کی چھوٹی سی چھوٹی قوموں سے ڈرتی اور کانپتی ہے۔ حج کے عظیم اجتماع میں خالی دعائیں مانگ کر چلی آتی ہے اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دے لیتی ہے کہ یہودی "مغضوب علیہ" قوم ہیں اس لئے یہ تباہ ہو کر رہیں گے۔ کمزور انسان اپنے مخالف کو گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے ہیں۔

اُمت کی یہ حالت ہے اور اس کے مذہبی پیشوا اس پر مسلسل زور دیئے جاتے ہیں کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ارکانِ اسلام کی رسمی طور پر پابندی کرتے رہیں اور ان کی غرض و غایت اور مقصود و مطلوب کے متعلق کچھ نہ سوچیں۔ اسی میں ہماری مختلف مملکتیں بھی اپنا اپنا مفاد مضمر دیکھتی ہیں اور مذہبی پیشوائیت کے فروغ کا سامان بہم پہنچا کر انہیں تاکید کرتی ہیں کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے   پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اسی کے پیشِ نظر، ابلیس نے اپنے مشیروں سے کہا تھا: ؎

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج   صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا   کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام!

(ابلیس کی مجلسِ شوریٰ - ارمغانِ حجاز)

ابلیس کا یہ سحر اس وقت ٹوٹے گا جب یہ قوم کتاب اللہ کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنا لیگی۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو خدا کا یہ انتباہ کارفرما ہو کر رہے گا کہ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ ﴿۴۷/۳۸﴾۔

اگر یہ (قرآن سے اسی طرح) روگرداں رہے تو ان کی جگہ کوئی دوسری قوم لے لیگی، اور وہ اِن جیسی نہیں ہوگی۔

خدا کے وعدوں کی طرح اس کی وعیدیں بھی اٹل ہوتی ہیں! اس استبدالِ قومی میں جو تباہی آتی ہے، وہ بڑی قیامت خیز ہوتی ہے۔ والسلام

(پرویز اگست ۱۹۸۱ء)

مفسدین کا انجام (۴/۸)

★ ——— پرویز

مکافاتِ عمل کے موضوع پر محترم پرویز صاحب کے سلسلۂ مضامین کی پہلی کڑی ——— ظلم کا انجام ——— طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت جولائی ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی تھی اور دوسری کڑی "سرمایہ داروں کا انجام" اگست ۱۹۸۴ء میں۔ زیرِ نظر مقالہ اسکی تیسری کڑی ہے۔ جس میں واضح کیا گیا ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے فساد کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس وقت جبکہ ساری دنیا کی کیفیت وہ ہو چکی ہے جس کا نقشہ قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں کھینچا تھا کہ .....

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ ... (۳۰/۴۱)

"لوگوں کے خود ساختہ نظام و اعمال کا نتیجہ یہ ہے کہ کرۂ ارض پر ہر جگہ فساد ہی فساد نظر آ رہا ہے"۔ ان تنذیراتِ قرآنی کا بار بار سامنے لانا نہایت ضروری ہے، بالخصوص اپنی قوم کے سامنے جو قرآنِ کریم پر ایمان رکھنے کی مدعی ہونے کے باوجود قرآن سے دور ہٹ چکی ہے۔

——— (۱) ———

اصلاح اور فساد، قرآنِ کریم کی دو اہم اصطلاحات ہیں اور ایک دوسرے کی ضد۔ ہمارے ہاں فساد کا لفظ دنگہ فساد یا لڑائی جھگڑے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور "صلح" کا لفظ "صلح صفائی" کے لئے، اور اصلاح، ریفارم کے معنوں میں۔ لیکن (عربی زبان اور) قرآنِ کریم میں یہ اصطلاحات، ان سے کہیں زیادہ وسیع معانی میں استعمال ہوئی ہیں۔ صلح کے بنیادی معنی ہوتے ہیں "جس چیز کو جس حال میں ہونا چاہیئے اسے ٹھیک اسی حال میں ہونا"۔ چنانچہ معاشرہ کی ناہمواریاں دور ہو جانے اور افراد کی صلاحیتوں کے مناسب نشوونما پا لینے کے لئے بھی یہی الفاظ آتے ہیں۔ اعمالِ صالحہ ان کاموں کو کہتے ہیں جن سے حسنِ کائنات میں نکھار پیدا ہو، جن سے معاشرہ کے بگڑے ہوئے کام سنور جائیں اور انسانی ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو جائے۔ فساد اس کی ضد ہے جس کے معنی ہیں، بگاڑ پیدا ہونا۔ توازن بگڑنا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کے پرکھنے کا معیار کیا ہے کہ ایک چیز کو جس حالت میں ہونا چاہیئے وہ اس حالت میں ہے یا نہیں۔ طبیعی اشیاء (PHYSICAL THINGS) کے متعلق یہ معلوم (یا طے) کرنا آسان ہے کہ جس شے کو جس حالت میں ہونا چاہیئے وہ اس حالت میں ہے یا نہیں۔ معمل (یعنی لیبارٹری) کا فیصلہ اس کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ لیکن انسانوں کی اخلاقی اور تمدنی دنیا میں اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں

کوئی مفسد، اس کا اقرار و اعتراف نہیں کرتا کہ وہ فساد پیدا کر رہا ہے۔ اس کا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ وہ مصلح (اصلاح کرنے والا ہے) چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ - قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ (۲/۱۱)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ملک میں فساد مت برپا کرو تو یہ کہتے ہیں کہ (ہم فساد کب برپا کرتے ہیں) ہم تو مصلح ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص بدنیتی سے فساد کو اصلاح سے تعبیر نہ کرتا ہو بلکہ نہایت نیک نیتی سے فساد کو اصلاح سمجھ کر اس کے لئے کوشاں ہو۔ لیکن نتیجہ دونوں صورتوں میں ایک ہی مرتب ہوگا۔ لہٰذا، اس چیز کو لوگوں کے انفرادی فیصلے پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس کے لئے کوئی خارجی معیار (OBJECTIVE STANDARD) ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے، حسبِ معمول، ہماری توجہ خارجی کائنات کے نظم و نسق کی طرف مبذول کرائی ہے اور کہا ہے کہ تم دیکھتے ہو کارگہ کائنات کس طرح ٹھیک ٹھیک چل رہا ہے۔ اس میں ہر شے ویسی ہی ہوتی ہے جیسی اُسے ہونا چاہیئے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ آج بارش کے پانی کے اجزاء کچھ اور ہوں اور کل وہ کچھ اور ہو جائیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ جَو کے بیج سے گندم پیدا ہو جائے اور گندم کے بیج سے جَو ——— سورج کبھی کہیں سے طلوع ہونا شروع ہو جائے اور کبھی کہیں سے، چاندنی کا رنگ آج کچھ اور ہو اور کل کچھ اور، کبھی خزاں میں پھول کھلنے لگ جائیں اور بہار میں مرجھا جائیں ——— ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ

۱۔ کائنات میں صرف ایک خدا کا قانون نافذ العمل ہے، کسی اور کا نہیں ——— اس لئے یکساں حالات میں ہر عمل کا نتیجہ بھی ایک جیسا مرتب ہوتا ہے۔ اسے سائنس کی اصطلاح میں (LAW OF UNIFORMITY OF NATURE) کہتے ہیں ——— اور

ہر شے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے جو اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ وہ قانون کو اپنی مرضی کے تابع نہیں رکھتی۔

اوّل الذکر کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا (۲۱/۲۲)

اگر ارض و سما (کائنات) میں خدا کے علاوہ کوئی اور صاحبِ اقتدار بھی ہوتا، تو اس میں فساد برپا ہو جاتا۔

اور ثانی الذکر کے سلسلہ میں کہا کہ

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ (۲۳/۷۱)

اگر حق (خدا کا قانونِ محکم) لوگوں کی مرضی کے تابع ہو جائے، تو ساری کائنات میں فساد برپا ہو جائے۔

یعنی فساد (بگاڑ) سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ (۱) قانون ایسا ہو جو کسی کی خواہش، مرضی، آرزو، یا مفاد

کے تابع نہ ہو ـــــ اور

۲ ۔ ہر ایک اس قانون کا اتباع کرے ۔ خارجی کائنات کا نظام اسی پروگرام کے مطابق چل رہا ہے ۔ اس میں جو قانون کارفرما ہے وہ نہ تو اشیائے کائنات کا اپنا پیدا کردہ ہے اور نہ ہی کسی کی خواہش کے مطابق اس میں تبدیلی ہو سکتی ہے اور دوسرے یہ کہ ہر شے اس قانون کے مطابق چلنے پر مجبور ہے ـــــ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۔ (۲۱/۱۹)

جہاں تک انسانوں کی تمدنی دنیا کا تعلق ہے، اس کے لئے بھی اُسی خدا نے قوانین مقرر کر دیئے ہیں جس نے اشیائے کائنات کے لئے قوانین مرتب کئے ہیں ۔ لیکن انسان اور دیگر اشیائے کائنات میں ایک بنیادی فرق ہے (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) اشیائے کائنات، متعلقہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور پیدا کی گئی ہیں، لیکن انسان کو اس باب میں صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے ۔ مشیت چاہتی یہ ہے کہ جو کچھ اشیائے کائنات مجبوراً کرتی ہیں، انسان وہی کچھ (یعنی قوانینِ خداوندی کا اتباع) اپنے اختیار و ارادے سے کرے، کہ اسی سے اس کی ذات کی نشو و نما اور شرفِ انسانیت کی بالیدگی ہوتی ہے ۔

لیکن انسان اپنے اختیار و ارادے کا استعمال غلط کرتا ہے اور اسی سے وہ فساد پیدا ہوتا ہے جو اس کی زندگی کو جہنم بنا دیتا ہے ۔ یہ اپنے لئے آپ قوانین وضع کرتا ہے اور پھر تماشا یہ کہ ان قوانین کا بھی کما حقہٗ اتباع نہیں کرتا ۔ ان سے بچنے کے لئے گریز کی ہزار راہیں نکالتا اور لاکھ حیلے تراشتا ہے ۔ ـــــ انسان کی یہی وہ ذہنیت (اور روش) ہے، جسے قرآنِ کریم نے قصۂ آدمؑ کے تمثیلی انداز میں بایں حسن و خوبی بیان کیا ہے ۔ ملائکہ اس جدید مخلوق کے ہیولائے آب و گِل کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (۲/۳۰) اسے با اختیار بنایا جا رہا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ زمین میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا ـــــ کہا کہ ٹھیک ہے ۔ اگر اسے علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا گیا تو یہ ایسا ہی کرے گا ۔ لیکن ہم اسے خود قوانینِ زندگی دیں گے ۔ (فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى) یہ اگر ان قوانین کا اتباع کرے گا تو پھر یہ حالت نہیں ہو گی ـــــ فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸) جو ان قوانین کا اتباع کرے گا تو ایسے لوگوں کو نہ خوف ہو گا نہ حزن، ان کی تمدنی زندگی فساد انگیزیوں سے مامون اور خون ریزیوں سے مصئون رہے گی ۔ اس کا نام اصلاح ہے ۔ اور اس کی خلاف ورزی کا نتیجہ فساد ـــــ ... اسی لئے تاکید کی گئی کہ ...... ـــــ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ـــــ جب تمہاری تمدنی زندگی بحالتِ اصلاح ہو تو اس میں فساد مت پیدا کرو ۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ

وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا ۔ (۷/۵۶)

دفعِ مضرت مقصود ہو، یا جلبِ منفعت (کسی کے نقصان سے بچنا چاہو، یا کوئی فائدہ حاصل کرنا ـــــ دونوں صورتوں میں) قانونِ خداوندی کو آواز دیا کرو، اور اس کے مطابق قدم اٹھایا کرو ۔ تمہاری زندگی فساد سے محفوظ ہو جائے گی ۔ اس کے برعکس اگر تم نے اس اصولِ حیات سے انکار کیا اور اس سے سرکشی برتی ـــــ خود بھی سرکشی برتی اور دوسروں کو بھی اس راستے پر چلنے سے روکا، تو اس سے اس قسم کا فساد پیدا ہو

جائے گا جس کی تباہیاں بڑھتی پھیلی جائیں گی۔ (۱۶/۸۲)

—(۰)—

ان اصولی ہدایات کے بعد قرآن کریم نے مخصوص انداز میں بتایا کہ انسانوں کی تمدنی زندگی میں فساد کس کس شکل میں رونما ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اس نے فسادِ ملوکیت کو نمایاں طور پر پیش کیا جس کی نمائندگی دنیا کا ہر فرعون کرتا ہے۔ ملوکیت سے مراد ہے ایسا نظامِ مملکت جس میں انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کی جائے۔ (خواہ اس کی عملی شکل ــــ جلالِ بادشاہی ہو، یا جمہوری تماشا)۔ مفادِ ملوکیت کا پہلا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسانی وحدت کو ختم کر کے انہیں مختلف گروہوں میں بانٹ دیا جائے ــــ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۲۵) جس انسانی برادری کو ملا کر رکھنے کا حکم خدا نے دیا تھا وہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور اس طرح زمین میں فساد برپا کر دیتے ہیں ــــ اس کی بدترین شکل، عصرِ حاضر کی قومیت پرستی (نیشنلزم) ہے جس نے (محض نقشوں پر کھینچی ہوئی فرضی اور غیر فطری لکیروں کے مطابق) عالمگیر انسانیت کو اس طرح مختلف گروہوں میں بانٹ رکھا ہے کہ ایک گروہ، دوسرے گروہ کے خون کا پیاسا، اور ایک قوم دوسری قوم کی جان کی دشمن بن رہی ہے۔ اس سے اگلا قدم، ایک قوم کے اندر مختلف پارٹیاں بنانا ہے۔ قرآن کریم نے فرعون کے خلاف جو سب سے بڑا جرم عائد کیا ہے، وہ یہی ہے کہ وہ قوم (بنی اسرائیل) کو پارٹیوں میں تقسیم کرتا رہتا تھا ــــ إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ ــــ فرعون نے ملک میں بڑی سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔ اس نے اودھم مچا رکھا تھا۔ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا۔ یعنی اس نے ملک کے باشندوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا ــــ اس پارٹی بازی سے اُس کا مقصد کیا تھا؟ یہ کہ ــــ يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ ــــ وہ اس طرح اس گروہ کو جسے سے اسے ذرا خطرہ محسوس ہوتا تھا، کمزور کر دیتا تھا۔ اس کی عملی شکل یہ تھی کہ ــــ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ۔ اس پارٹی کے ان افراد کو جن میں جوہرِ مردانگی کی نمود ہوتی، ذلیل و خوار کر دیتا اور "زنخوں" کو آگے بڑھاتا چلا جاتا ــــ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ (۲۸/۴) ــــ یہ تھی اس کی فساد انگیزی جس سے اس نے معاشرہ میں اس قدر ناہمواریاں پیدا کر رکھی تھیں۔

اور یہ چیز کسی خاص فرعونی حاکم کے ساتھ مخصوص نہیں تھی، یہ ملوکانہ حکمتِ عملی ہے، جو ہر زمانے میں اسی طرح کارفرما رہتی ہے۔ چنانچہ سورۂ نمل میں، اس حقیقت کو (ملکہ سبا کی زبانی) ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ

إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ (۲۷/۳۴)

یاد رکھو! جب بادشاہ کسی ملک پر چڑھائی کرتے ہیں تو اسے اُلٹ پلٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ یعنی

ﷺ آ بتاؤں تجھ کو شرحِ آیۂ إِنَّ الْمُلُوكَ ــ سلطنتِ اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری! (اقبالؒ)

وہاں کے صاحبِ عزت اکابرین کو سب سے زیادہ ذلیل و خوار بنا دیتے ہیں اور یہ بات کسی خاص بادشاہ سے متعلق نہیں، ملوکیت میں یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے اور یہی کچھ ہوتا رہے گا۔

ملوکیت کے وجود اور بقا کا راز یہی اس میں ہے کہ قوم مختلف پارٹیوں میں بٹی رہے، اور اس میں ایسا اتار چڑھاؤ ہوتا رہے کہ کبھی ایک گروہ اوپر آجائے اور کبھی دوسرا —— اور اس عمل میں دو لابی میں نکتہ یہ پیشِ نظر رہے کہ جس فرد یا گروہ میں کہیں جوہرِ انسانیت کے آثار محسوس ہوں، انہیں کچل کر رکھ دیا جائے اور اپنے گروہ پیش انہیں رکھا جائے جن میں ابھرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔ یہ تھی فسادِ آدمیت کی وہ اوّلین لعنت جسے مٹانے کے لئے آسمانی انقلاب کے داعی (حضرات انبیاء کرام ؑ) دنیا میں آتے رہے —— اور یہی تھی ان کی وہ انقلابی دعوت، جسے ملوکیت کے علمبردار "فساد" سے تعبیر کر کے، کچل دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب صاحبِ ضربِ کلیم، حضرت موسیٰ ؑ نے اس حکمتِ فرعونی کے خلاف آواز بلند کی تو فرعون کے درباریوں نے اس سے کہا کہ

أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ (۷/۱۲۷)

کیا تو موسیٰ ؑ اور اس کی قوم کو اس طرح آزاد چھوڑ دینا چاہتا ہے کہ ملک میں فساد برپا کر دیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ ملوکیت کے نمائندگان کے نزدیک "اصلاح" کا تصور کیا ہوتا ہے اور "فساد" سے مراد کیا؛ ہر مستبد قوت، معاشرہ میں صحیح اصلاح کو فساد سے تعبیر کر کے، اس کے داعیان کو ختم کر دینا چاہتی ہے۔ یہ ارباب اقتدار کا گروہ ہوتا ہے، جسے اس قسم کے صحیح انقلاب میں، اپنی مفاد پرستیوں کی موت نظر آتی ہے —— قرآن کریم میں ہے کہ جب حضرت صالح ؑ نے، قوم ثمود کی فساد انگیزیوں کے خلاف، (جن کی تفصیل ذرا آگے چل کر آئے گی) اعلانِ احتجاج کیا تو اس قوم کے اربابِ اقتدار کو خطرہ محسوس ہوا۔ ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی۔

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (۲۷/۴۸)

دارالسلطنت میں صرف نو بڑے بڑے سردار تھے، جن کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار تھی۔ وہی ان تمام شرارتوں کی جڑ تھے۔ وہ ملک میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے تھے اور قوم کو کبھی اصلاح کی طرف نہیں آنے دیتے تھے۔

چنانچہ

انہوں نے اپنی میٹنگ بلائی اور آپس میں کہا کہ قسم اٹھاؤ کہ ہم سب مل کر صالح ؑ اور اس کے ساتھیوں پر رات کے وقت حملہ کریں گے اور پھر ان کے ورثاء کے سامنے صاف مکر جائیں گے اور کہہ دیں گے کہ ہم نے انہیں قتل ہوتے دیکھا تک نہیں اور ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔ (۲۷/۴۹)

—— (۱) ——

یہ تھی فسادِ آدمیت کی پہلی شکل —— یعنی بساطِ ملوکیت کی مہرہ بازیاں —— اس کی دوسری شکل معاشی ناہمواریاں ہیں جن کا ذکر قرآنِ کریم نے بڑی شرح و بسط سے کیا ہے۔ اس نے قصۂ آدم کے (تمثیلی انداز)

ہیں، اس "جنت کی زندگی" کے متعلق، جس میں ہنوز فساد پیدا نہیں ہوا تھا، کہا کہ اس میں کیفیت یہ تھی کہ

وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا - (۲/۳۵)

ہر ایک کو، ہر جگہ، سیر ہو کر کھانے کو ملتا تھا ـــــ اس میں کسی فرد کو، نہ بھوک کا خوف ستاتا تھا، نہ پیاس کا ـــــ نہ لباس کی محتاجی تھی نہ مکان کی (۲۰/۱۱۸-۱۱۹)

یہ تھی معاشرہ کی وہ حالت جسے فساد نے نہیں چھوا تھا۔ اس کے بعد، حقیقت فراموش انسان کی مفاد پرستی نے اس میں فساد پیدا کر دیا تو معاشرہ کی یہ حالت باقی نہ رہی۔ مصلحینِ انسانیت، حضرات انبیاء کرام آتے رہے، تاکہ معاشرہ کو پھر سے انہی خطوط پر متشکل کریں۔ وہ قوم سے کہتے یہ کہ

كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ - (۲/۶۰)

خدا نے جس قدر سامانِ زیست عطا کیا ہے، اس میں سے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق کھاؤ پیو۔ اور زمین میں فساد مت برپا کرو ـــــ معاشرہ میں ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔

قرآنِ کریم نے جن اقوام کی سرگزشت بیان کی ہے، ان میں سے، قوم ثمود نے اسی قسم کی معاشی ناہمواریاں شدید طور پر پیدا کر رکھی تھیں۔ اس زمانے کی معیشت، گلہ بانی پر مبنی تھی۔ قوم کے ذی قوت طبقہ نے، ملک کی چراگاہوں اور چشموں پر اس طرح قبضہ کر رکھا تھا کہ کمزوروں اور غریبوں کے مویشیوں کو نہ کھانے کو چارہ ملتا تھا، نہ پینے کو پانی ـــــ حضرت صالحؑ اس "فساد" میں "اصلاح" پیدا کرنے کے لئے اٹھے۔ انہوں نے ان مستبد سرداروں سے کہا کہ ـــــ فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (۷/۷۴) ـــــ خدا نے تمہیں جن نعماء سے نوازا ہے، انہیں پیشِ نظر رکھو، اور ملک میں فساد برپا نہ کرو۔ معاشی ہمواریاں پیدا کرو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تمام مویشیوں کی باری باندھ لو ـــــ خواہ وہ غریبوں کے مویشی ہوں۔ اور خواہ امیروں کے، رزق کی ضرورت تو ہر مویشی کو ہوتی ہے۔ ان کی ضروریات کو پورا ہونے دو۔

قوم مدین کا معاشی نظام، کاروباری تھا، اور انہوں نے اس میں بھی فساد پیدا کر رکھا تھا۔ اس فساد کی تشریح، حضرت شعیبؑ کے الفاظ میں یوں بیان ہوئی ہے۔ انہوں نے قوم سے کہا کہ

فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا - (۷/۸۵)

(تمہیں چاہیئے، کہ اپنے معاشی نظام میں عدل سے کام لو) ماپ تول کو پورا رکھو۔ لوگوں کے حقوق واجبات میں کمی نہ کرو، اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہو جانے کے بعد، ناہمواریاں مت پیدا کرو۔

قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر، قوم مدین کی اس فساد انگیزی کا ذکر کیا ہے اور ہر مقام پر اسے انہی الفاظ میں تعبیر کیا ہے (مثلاً ۱۱/۸۵ و ۲۶/۱۸۱-۱۸۳) ـــــ "ماپ تول پورا رکھنے" سے مراد اتنا ہی نہیں کہ ترازو اور باٹ صحیح صحیح رکھو، اس سے مقصد یہ ہے کہ اپنے معاشی نظام کو عدل کی بنیادوں پر استوار کرو۔

معاشی فساد کی بنیاد سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے۔ قرآن کریم نے قارون کو اس ذہنیت کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سورۂ قصص میں اس کی "فساد انگیزی" کی تفصیل ان الفاظ میں آئی ہے:۔

قارون، قوم موسیٰؑ ہی کا ایک فرد تھا، کوئی غیر نہیں۔ لیکن اپنی دولت کے بل بوتے پر اپنی قوم کے افراد سے بڑی زیادتی کرتا تھا۔ چنانچہ اس طرح اس کے پاس اس قدر دولت جمع ہو گئی کہ اس کے خزانے کی حفاظت کے لئے ایک طاقتور جماعت کی ضرورت تھی۔ اس دولت کے نشہ نے اُسے مدہوش کر دیا تھا۔ چنانچہ اس کی قوم کے ہوشمند طبقہ نے اس سے کہا کہ تم اس مال و دولت پر اس قدر اتراؤ نہیں، اس کا نتیجہ خراب ہوگا۔ یہ روش قانونِ خداوندی کی رُو سے پسندیدہ نہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ تم مال و دولت کو تیاگ کر تارک الدنیا بن جاؤ۔ ہرگز نہیں۔ ہم کہتے یہ ہیں کہ تم اس سے بھی فائدہ اٹھاؤ۔ لیکن اس حقیقت کو فراموش مت کرو کہ زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی نہیں جس میں انسان کا منتہائے نگاہ مال و دولت جمع کرنا ہوتا ہے اور بس۔ زندگی اس سے آگے بھی چلتی ہے۔ اس مال و دولت سے تم اُس زندگی کو بھی خوشگوار بناؤ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح خدا نے تمہاری ہر کمی کو پورا کر کے تمہاری زندگی کو حسین بنا دیا ہے، اسی طرح تم دوسروں کی کمی کو پورا کر کے ان کی زندگی کو بھی حسین بنا دو۔ اور معاشرہ میں فساد (ناہمواریاں) مت پیدا کرو (کہ تم امیر سے امیر تر ہوتے جاؤ، اور دوسرے لوگ غریب سے غریب تر ہوتے جائیں۔ اسی کو فساد کہتے ہیں) اور فساد پیدا کرنے والوں کو خدا کبھی پسند نہیں کرتا۔

یہ سُن کر اس نے ان سے کہا کہ تمہیں میرے معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔ یہ دولت میں نے اپنی ہنرمندی اور چابکدستی سے کمائی ہے، اس لئے اسے جس طرح میرا جی چاہے، صرف کروں۔ اس میں خدا کا کیا دخل ہے اور کسی کو مجھ سے باز پرس کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟

اے کاش! اُسے معلوم ہوتا کہ اس قسم کی ذہنیت نے اس سے پہلے کتنی قوموں کو تباہ کر دیا تھا جو اس سے زیادہ قوت و حشمت کی مالک تھیں، اور انہوں نے مال و دولت بھی اس سے کہیں جمع کر رکھا تھا۔ خدا کے قانونِ مکافات نے انہیں تباہ کر دیا۔ ان کے یہ جرائم اس قدر بدیہی اور نمایاں تھے کہ اس کی بھی ضرورت نہ پڑی کہ ان کے متعلق کچھ پوچھ گچھ کی جاتی۔ (نظامِ سرمایہ داری کی تو بنیاد میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی تباہی کہیں خارج سے نہیں آیا کرتی۔) (مفہوم القرآن $\frac{28}{76-82}$)

اور فساد کا یہی تباہ کن انجام ہے جس کی طرف قرآن کریم نے بار بار توجہ دلائی ہے ـــــ کہیں عمومی حیثیت سے اور کہیں فساد انگیز قوموں کی تباہی کا خصوصی ذکر کر کے ـــــ عمومی طور پر کہا کہ

اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ـــ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا یُفْسِدُوْنَ ۔ ($\frac{16}{88}$)

جو لوگ اس صداقت سے خود بھی انکار کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی اس طرف آنے نہیں دیتے، ان کی تباہیاں دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ اس فساد کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ جسے وہ معاشرہ میں برپا کرتے ہیں۔

سورۂ بقرہ میں، اس روش کے حاملین کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ ـــــ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ($\frac{2}{27}$)

ان لوگوں کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ سورۂ یونس میں کہا کہ

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ (10/81)

یہ یقینی بات ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے، ایسا ہو نہیں سکتا کہ معاشرہ میں فساد پیدا کرنے والوں کے کام سنور جائیں۔ یعنی معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہو جائے اور جو لوگ اس بگاڑ کے ذمہ دار ہوں، ان کی حالت سنورتی جائے یہ ناممکن ہے۔ حالت انہی کی سنورے گی جو معاشرہ کو سنوارنے کی کوشش کریں گے۔ سورۂ صٓ میں ہے۔

أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ ...... (38/28)

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں۔ اور معاشرہ کو سنوارنے والے کام کریں، وہ اور وہ لوگ جو معاشرہ میں فساد پیدا کریں، دونوں برابر ہو جائیں۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔

اس اصولِ محکم کی تبیین کے لئے اس نے کہا کہ تاریخ کے اوراق پر غور کرو اور دیکھو کہ جن اقوام نے اس قسم کی روش اختیار کی تھی، ان کا انجام کیا ہوا؟ —— وَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ۔ (7/86) عاد اور ثمود اور فرعون وغیرہ نے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کیں —— فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ۔ (89/13) تو خدا کے قانونِ مکافات نے انہیں کس طرح سے تباہ کر دیا۔

یہ تباہی اس وقت آتی ہے جب معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنے کی روش عام ہو جائے اور جو لوگ اس پوزیشن میں ہوں کہ اس غلط روش کا سدِّباب کر سکیں وہ بھی لوگوں کو اس سے روکنے کی کوشش نہ کریں۔ چنانچہ اقوامِ سابقہ کی سرگذشت بیان کرنے کے بعد، قرآنِ کریم نے کہا کہ ان اقوام میں سے

جو لوگ تباہی سے بچ جاتے تھے، ان میں سے کبھی بعد میں، معدودے چند ایسے رہ جاتے جو اپنے مفاد کو خدا کے قانون کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور ملک میں لوگوں کو ناہمواریاں پیدا کرنے سے روکتے، ورنہ باقیوں کا حال تو یہ ہو جاتا کہ وہ قوانینِ خداوندی سے سرکشی برت کر، اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہتے اور دوسروں کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر لے جاتے، تاکہ ان کی آسودگیوں اور تن آسانیوں میں فرق نہ آنے پائے (خواہ باقی مخلوق پر کچھ ہی کیوں نہ گزرے، یہ تھے ان کے جرائم جن کی وجہ سے ان پر تباہی آتی تھی۔

(مفہوم القرآن - 11/116)

—— (٥) ——

آپ قرآنِ کریم کے ان مقامات پر غور کریں اور پھر سوچیں کہ اس نے فسادِ آدمیت کی جو جو شقیں بتائی ہیں، کیا وہ ہمارے معاشرے میں جمع نہیں ہو رہیں؟ اور اگر یہ حقیقت ہے تو کیا اس اندازِ معاشرت کا حتمی اور یقینی

نتیجہ وہی نہیں ہوگا جو اقوامِ سابقہ کے ہاں ہوا تھا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری حالت اس وقت بعینہٖ ویسی ہی ہوچکی ہے جیسی قوم مدین کی تھی۔ اس قوم کے متعلق جو کچھ قرآنِ کریم نے کہا ہے وہ ہر قلبِ حساس کے لئے سامان صد ہزار عبرت اپنے اندر رکھتا ہے۔ سورہ ہود میں ہے۔

اور اسی طرح ہم نے قوم مدین کی طرف، ان کے بھائی بند، شعیبؑ کو بھیجا۔ اس نے ان سے کہا کہ تم اپنے آئین و رسوم کو چھوڑ کر، صرف خدا کے قوانین کی اطاعت اختیار کرلو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت تو تم بڑے خوشحال ہو لیکن تم نے اپنے معاشرہ میں سخت ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس حالت کو بدلو۔ اپنے ناپ تول کے پیمانوں کو پورا رکھو۔ ہر ایک کو اس کا پورا پورا حق دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو مجھے خطرہ ہے کہ تم پر ایسی تباہی آجائے گی جو تم سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

اے میری قوم کے لوگو! اپنے معاشی نظام کی بنیاد عدل و انصاف پر رکھو اور کسی کے حق میں کمی نہ کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو ملک میں سخت ناہمواریاں (فساد) پیدا ہو جائیں گے اور معاشرہ تہس نہس ہو جائے گا۔

یاد رکھو! جو کچھ تم اس طرح فریب کاری اور سلب و نہب سے اکٹھا کر لیتے ہو، اگرچہ وہ بظاہر بہت کچھ نظر آتا ہے لیکن وہ تمہارے لئے قطعاً نفع بخش نہیں ہو سکتا۔ ثبات و دوام صرف ان مفاد کے لئے ہے جو قوانینِ خداوندی کے مطابق حاصل کئے جائیں ـــــ اور خدا کا قانون یہ ہے کہ ثبات و دوام اسے حاصل ہو سکتا ہے، جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ لیکن یہ بات تمہاری سمجھ میں اس وقت آسکتی ہے جب تم خدا کے قانون کی صداقت کو تسلیم کرو۔ اگر تم اسے تسلیم نہیں کرتے، تو تم سے اسے جبراً نہیں منوایا جا سکتا۔ میرا کام تم تک اس پیغام کو پہنچا دینا تھا۔ میں تم پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا جو تم سے جبراً یہ کچھ منواؤں۔ (مفہوم القرآن - ۱۱/۸۴-۸۶)

ہم سمجھتے ہیں کہ اس باب میں اس سے زیادہ اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جب تک قوم، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں لاتی ـــــ یعنی اسے ایک حقیقت کے طور پر تسلیم نہیں کرتی۔ اس کی حالت میں تبدیلی نہیں آسکتی ـــــ اور جب تک یہ اپنی موجودہ روش میں تبدیلی پیدا نہیں کرتی، یہ تباہی سے بچ نہیں سکتی۔ یہ خدا کا قانون ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔

اور خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

(۰)

طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک

(جسے معلوماتِ عامہ کے لئے وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا ہے۔)

(۱) تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اسے اپنے رہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

(۲) خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے ابد تک ضابطۂ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آ سکتا ہے۔ قرآنِ کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتمآب خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

(۳) قرآنِ کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابعِ تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

(۴) نبی اکرم کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمتِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے۔ سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورؐ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی اصول صحابۂ کبارؓ کی سیرتِ مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہیئے۔

(۵) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظامِ مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظامِ زندگی کا نام ہے) ممکن نہیں ہو سکتا۔

(۶) رسول اللہ صلعم نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآنِ کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امورِ مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

(۷) رسول اللہ کے بعد دین کا وہی نظام حضورؐ کے خلفائے راشدین نے جاری رکھا۔ اس میں امورِ مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآنِ کریم نے

طرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر اُمّت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔

(۸) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہوگیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے اُمّت میں انتشار پیدا ہوگیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور، دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن اب مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہوگئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

(۹) ہمارے لئے کام کرنے کا یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو اُمّت کو احکام قوانینِ خداوندی کے مطابق چلائے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانینِ خداوندی کے تابع ہوگی۔

(۱۰) چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا۔ اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کیلئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہمدگر مدغم ہوجائیں گے۔

(۱۱) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا، اُمّت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز، روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردّ و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اُسے "خدا اور رسول" کا طریقہ قرار دے۔

(۱۲) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی، روٹی، کپڑا، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

(۱۳) قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہوسکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

(۱۴) جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآنِ کریم کے مطابق ہو، یا جس سے حضور نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

(۱۵) ہم، رسول اللہؐ کے بعد، ہر قسم کے مدعیٔ وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

(۱۶) طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقے سے (اسے فرقہ اہلِ قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)۔ نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ اُمّت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز، روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں، ہم ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کرتے۔ اور بلا ردّ و بدل ان کی پابندی کرتے ہیں۔ ہم قرآنِ کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔ یہ ہے ہمارا مسلک، جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کے خلاف جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ مخالفین کا گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے۔